تجلّیات

سیرت اہل بیت علیہم السلام

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تجلّیات

سیرت اہل بیت علیہم السلام

آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیاسی زندگی کے نورانی پہلو

مؤلف

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ شیخ حسن بن موسیٰ الصفار

مترجم

حجۃ الاسلام علامہ حسن رضا باقر

ناشر

اِدارہ منہاج الحسینؑ پاکستان رجسٹرڈ

ادارہ منہاج الحسینؑ رجسٹرڈ

IDARA MINHAJ UL HUSSAIN(R)

R. Trade mark

IDARA MINHAJ-UL-HUSSAIN PAKISTAN

ادارہ منہاج الحسینؑ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

تاسیس 1990ء

الزہراءؑ میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ

AL-ZAHRA MEDIA PVT. LTD.

R. Trade mark

جملہ حقوق بحق ناشر ادارہ محفوظ ہیں

تعارف کتاب

نام کتاب	:	تجلیات سیرت اہل بیت علیہم السلام
مئولف	:	حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ شیخ حسن بن موسیٰ الصفار
مترجم	:	حجۃ الاسلام علامہ حسن رضا باقر
زیرنگرانی ونظرثانی	:	علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر
کمپوزنگ	:	شعبہ تحریر وتحقیق ادارہ منہاج الحسینؑ
ایڈیشن	:	اول
تعداد	:	1000 عدد
تاریخ اشاعت	:	جنوری 2020ء
آئی ایس بی این	:	ISBN:978-969-9027-41-3
ناشر	:	ادارہ منہاج الحسینؑ رجسٹرڈ لاہور
پیشکش	:	الزہراء میڈیا پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور
ملنے کا پتہ	:	ادارہ منہاج الحسینؑ جوہر ٹاؤن لاہور القطیف ۔ المملکۃ العربیہ السعودیہ

مؤلف کا پتہ

المملکۃ العربیۃ السعودیۃ
القطیف
ص ب: 1322 القطیف: 31911
فون: 8555210 13 966+
فیکس: 8512600 13 966+
ای میل: office@saffar.org
ویب: www.saffar.org

فہرست مطالب

تعارف مئولف	.....	10
پیش لفظ	.....	14
مقدمہ مئولف	.....	18
مقام اہل بیتؑ	.....	27
نص اور شوریٰ کے درمیان عقیدہ امامت	.....	46
اہل بیتؑ کا مدمقابل حکومتوں سے برتاؤ	.....	62
آئمہ اطہارؑ کے زمانے کی حکومتیں	.....	80
حضرت امام موسیٰ کاظمؑ کا منہاج اور اخلاق	.....	98
حضرت امام علی رضاؑ اور وسعت قلبی کا ثمرہ	.....	114
حضرت امام جوادؑ کی سیرت سے چند نمونے	.....	134
حضرت امام حسن عسکریؑ کے ارشادات	.....	152
مصادر و مآخذ	.....	172

علامہ الشیخ حسن بن موسیٰ الصفار کا تعارف

علامہ الشیخ حسن بن موسیٰ الصفار کا تعارف

حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین سرکار علامہ الشیخ حسن بن موسیٰ بن الشیخ رضی الصفار ادام اللہ عزہ 1958ء بمطابق 1377ھ مملکۃ عربیہ سعودیہ کے مشرقی منطقہ کے مشہور و معروف شہر قطیف میں پیدا ہوئے ۔قطیف شہر سو فیصد شیعہ اثنا عشری مومنین اور مساجد اور امام بارگاہوں اور علمی مراکز کا شہر ہے،

آپ نے قرآن کریم کی تعلیم وہاں کے ابتدائی دینی مدارس میں حاصل کی ۔جبکہ سکول ابتدائی تعلیم امام زین العابدینؑ پرائمری سکول قطیف میں اور میٹرک کا امتحان الامین ہائی سکول قطیف سے پاس کیا۔اس کے بعد مزید اعلی دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے 1971ء بمطابق 1391ھ کو حوزہ علمیہ نجف اشرف عراق کا رخ کیا، وہاں کئی سال تحصیل علوم دینیہ میں مصروف رہنے کے بعد 1973ء بمطابق 1393ھ حوزہ علمیہ قم المقدسہ ایران تشریف لے آئے وہاں پر وہاں کے مشاہیر علماء اعلام اور اساتذہ کرام سے کسب فیض کیا اور پھر کویت کے واحد شیعہ حوزہ علمیہ جو حضرت آیت اللہ العظمی السید محمد شیرازی قدس سرہ نے اپنی نگرانی میں ''مدرسہ الرسول الاعظمؐ'' کے نام سے قائم کیا تھا وہاں پر تعلیم و تعلم کا فریضہ سرانجام دیتے رہے پھر اسلامی جمہوری ایران کا رخ کیا اور وہاں 1980ء بمطابق 1400ھ سے لیکر 1988ء بمطابق 1408ھ تک اعلیٰ تعلیم حاصل کی ۔اور پھر مختلف جامعات اور حوزات

علمیہ میں علوم شرعیہ اور مختلف علوم، صرف نحو، منطق ، فلسفہ، قرآن وحدیث ، فقہ واصول میں سطوحات عالیہ تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔

آپ نے میدان خطابت میں گیارہ سال کی عمر میں 1968ء بمطابق 1388ھ قدم رکھا اور پھر مختلف ممالک میں مجالس، محافل، سیمینار، کانفرنسز میں مختلف تاریخی ایام کی مناسبت سے حصہ لیا۔ اس کیساتھ ساتھ کویت ، عراق ، ایران اور لبنان کے مختلف ٹی وی چینلز میں شخصیت سازی، معاشرہ سازی، ثقافت اور انسانی حقوق کی پاسداری کے موضوعات پر لیکچر دیتے رہے۔ آپ نے اب تک مختلف موضوعات پر 135 کتابیں تالیف کی ہیں جن میں سے کئی ایک کے عربی سے دوسری زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔ جن میں اب تک بیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کتب کے علاوہ مختلف عربی ممالک کے روزناموں میں آپ کے مضامین شائع ہوئے جن کا سلسلہ اب تک جاری ہے آپ نے بہت سی تنظیموں کی نہ صرف بنیاد رکھی بلکہ ان کی سربراہی بھی کی اور معاشرتی ،ثقافتی ، سیاسی قبائلی قومی وطنی امور میں انقلابی اقدامات کئے خاص طور پر سعودی عرب کے سلفی اور شیعہ علماء اور زعماء دانشوروں کے درمیان مکالمات کا سلسلہ شروع کیا جن میں اکثر مکالمے شائع بھی ہو چکے ہیں اور وہ مکالمے سعودی عرب، ایران، کویت، قطر، لندن، لبنان کے ٹی وی چینلز پر نشر بھی ہوئے۔

آپ کی علمی وجاہت اور ہر دلعزیز شخصیت ہونے کے اعتراف میں دور حاضر کی علمی شخصیات اور مراجع عظام نے آپ پر بھرپور اعتماد کرتے ہوئے روایت حدیث، اجراء فتویٰ ، ولی فقیہ اور مجتہد جامع شرائط سے مربوط شرعی ودینی اختیار اور حقوق ۔۔۔۔ وغیرہ کے اجازہ جات سے سرفراز فرمایا۔ ان عظیم شخصیات میں سے درج ذیل قابل ذکر ہیں۔

حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید علی السیستانی مدظلہ نجف اشرف عراق

حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید محمد الحسینی الشیرازی قدس سرہ قم المقدسہ ایران

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الشیخ محمد اسحٰق الفیاض مدظلہ نجف اشرف عراق

حضرت آیت اللہ العظمیٰ الشیخ ناصر مکارم شیرازی مدظلہ قم المقدسہ ایران

حضرت آیت اللہ العظمیٰ السید صادق الحسینی الشیرازی مدظلہ قم المقدسہ ایران

حضرت آیت اللہ السید محمد حسین فضل اللہ لبنان

آپ کا اس وقت سعودی عرب کے شیعہ فعال ترین بابصیرت علمی، ثقافتی اور دینی سیاسی شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔ آپ اس وقت کئی اداروں اور مساجد کی سرپرستی کررہے ہیں۔ قطیف میں آپ نے بہت بڑا حوزہ علمیہ قائم کیا ہوا ہے جس میں سعودی عرب کے تشنگان علوم محمد وآل محمد علیہم السلام طلاب تعلیم حاصل کرنے میں مشغول ہیں۔ آپ سعودی شیعہ مسلمانوں کے مرجع اور قائد ہیں۔ سعودی حکومت کے مختلف اداروں میں شیعہ حقوق اور قوانین کے حصول، دفاع اور حکومت کی رہنمائی کے سلسلہ میں آپ کی مثالی خدمات کا لامتناہی سلسلہ ہے جس وجہ سے سعودی عرب کے شیعہ عوام الناس اور سلفی اور حنبلی اہلحدیث علماء اور عوام آپ کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ حکومتی حلقوں میں بھی آپ کی بات سنی اور مانی جاتی ہے۔ ہر سال حجاج کرام کی خدمت اور رہنمائی کیلئے اپنی طرف سے علماء کے وفود مکہ مکرمہ بھیجے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ بتصدق محمد وآل محمد علیہم السلام ان کو صحت وسلامتی کے ساتھ اسلام ومسلمین اور مومنین کی خدمت کرنے کی توفیق مزید عطا فرمائے، حوادث زمانہ اور شر اعداء وشیاطین سے محفوظ رکھے اور ملت اسلامیہ کے سروں پر ان کا سایہ قائم ودائم رکھے۔ آمین

ملک محمد سبطین اکبر

صدر ادارہ منہاج الحسینؑ لاہور پاکستان

پیش لفظ

علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر

سربراہ ادارہ منہاج الحسین لاہور پاکستان

پیش لفظ

علامہ ڈاکٹر محمد حسین اکبر
سربراہ ادارہ منہاج الحسین لاہور پاکستان

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِ الْاَنْبِيَاءِ وَخَاتَمِ الْمُرْسَلِيْنَ وَ عَلٰى اٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَ عَلٰى اَصْحَابِهِ الْمُنْتَجِبِيْنَ وَاللَّعْنَةُ الدَّآئِمَةِ عَلٰى اَعْدَآئِهِمْ اَجْمَعِيْنَ .اَمَا بَعْدُ.

السلام علیکم یا ساسۃ العباد وارکان البلاد

زیارت جامعہ کا شمار مشہور و معروف زیارات میں ہوتا ہے جس کی کئی کئی جلدوں میں متعدد شروحات لکھی گئی ہیں ۔ جو حضرات آئمہ معصومین علیہم السلام کی عظمت اور اختیارات کو واضح کرتی ہے اسی زیارت کے ضمن میں آئمہ اطہار علیہم السلام کی خدمت اقدس میں سلام پیش کرنے کا ایک انداز اس طرح ذکر ہوا ہے۔ ''اے بندگان خدا کے سیاستمدارو، آبادیوں کے سردارو! آپ پر سلام ہو''

اگر چہ ہمارے معاشرے میں بدکردار سیاستدانوں کی وجہ سے لفظ سیاست بدنام ہو چکا ہے اور ایسے بدکردار سیاستدانوں کی سیاست کو عرف عام میں محاورہ ''سیاست معاویہ'' کے

علمبردار کہا جاتا ہے۔ جس معاویہ ابن ابی سفیان کی سیاست کے بارے میں حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا تھا۔

''اگر مجھے قرآن وسنت اجازت دیتے تو جو کچھ معاویہ کرتا ہے میں اس سے کہیں زیادہ بہتر سیاستدان تھا'' معاویہ کی سیاست حضرت علی علیہ السلام کی سیرت اور کردار کے بالکل برعکس تھی۔ ظلم وستم، صحابہ کرام کا قتل، امام عادل وحق حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی بیعت شکنی اور جنگ صفین میں علیؑ کے مدمقابل جنگ کرنا، دمشق کے محراب ومنبر سے نماز جمعہ کے خطبات میں علی ابن ابیطالب علیہ السلام کو سب وشتم کرانا، شیعیان علیؑ کے قتل عام کے ساتھ ساتھ ان اموال کو غصب کرنا، معاویہ کے کردار کی چند جھلکیاں ہیں۔ سیاست یعنی بندگان خدا کے معاملات زندگی کو اس طرح منظّم ومرتب کرنا کہ وہ اپنے اپنے حقوق کے اندر آزادی اور سکھ وچین کے ساتھ آسودہ زندگی بسر کرسکیں۔

بارہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیاست اور طرز زندگی حضرت خاتم الانبیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حرف بہ حرف عملی مظاہرہ تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ اور اسوہ حسنہ وحی الٰہی اور قرآن کے عین مطابق تھا۔ لہٰذا سیاست بذات خود کوئی بری شئی نہیں اس کو اپنانے والے کردار اسے اچھا یا برا بناتے ہیں۔

ہمارے تمام امام جو کہ خلفاء رسول خاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آئمہ امت تھے اور ہیں انہوں نے تخت وتاج کی پرواہ کئے بغیر مخلوق خدا کی خدمت اور تربیت کا سلسلہ جاری رکھا بلکہ اموی اور عباسی ظالم حکمرانوں کے مظالم کا صبر واستقامت سے مقابلہ کرتے ہوئے ہمیشہ مخلوق خدا کی رہنمائی اور خدمت کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور اپنے پیروکاروں کو ظالموں کے اندر رہ کر زندگی گزارنے کا عملی سبق دیا کہ نہ خدا ناراض ہو اور نہ رسول اور آل محمد علیہم السلام۔ ان کے اسی کردار کے چند نمونے حضرت حجۃ الاسلام والمسلمین الشیخ حسن بن موسیٰ الصفار نے اپنی اس کتاب ''تجلیات سیرت اہل بیت علیہم السلام'' میں بیان کئے ہیں۔

انداز انتہائی علمی، مدلل اور سادہ اور مطالب سے بھرپور ایک ایک سطر میں آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت کی روشنی میں دینی وسیاسی ومعاشرتی زندگی گزارنے کے اصول وضوابط، عظمت اہلبیت ؑ، قرآن وحدیث کی روشنی میں سلاست اور اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے قلم کو اس طرح جولان دی کہ قاری جب اس کو پڑھنا شروع کرتا ہے تو آخری صفحہ تک پڑھے بغیر کتاب بند نہیں کرتا۔

اس عظیم تالیف اور مجموعہ کا اردو زبان میں ترجمہ کا شرف ادارہ منہاج الحسینؑ لاہور کے شعبہ تحقیق، تالیف وترجمہ کے انچارج اور استاد فاضل عالم عزیزم حجۃ الاسلام حسن رضا باقر سلمہ تعالیٰ نے کر کے قارئین کی خدمت میں عظیم تحفہ ہدیہ کیا ہے۔ جنہوں نے عربی سے اردو زبان میں ترجمہ کا حق ادا کیا ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام تر مطالب کے مصادر اور مدارک کو ساتھ ساتھ بھی ذکر کیا گیا ہے اور کتاب کے آخر میں شامل کتاب بھی کر دیا گیا ہے۔

ادارہ منہاج الحسینؑ کے شعبہ نشر واشاعت کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے کہ وہ اس تالیف لطیف کو شائع کر کے تشنگان علوم محمد وآل محمد اور عاشقان سیرت اہلبیت نبوت علیہم السلام کی خدمت میں پیش کرے۔

اللہ تعالیٰ بحق محمد وآل محمد علیہم السلام مئولف جلیل عالم نبیل حضرت علامہ شیخ حسن بن موسیٰ الصفار اور مترجم عزیزم علامہ حسن رضا باقر اور ادارہ منہاج الحسینؑ کے خدمت گزاروں کی اس کاوش کو اپنے حضور قبول ومقبول فرمائے اور ہم سب کے ذخیرہ آخرت قرار دے۔ آمین۔

والسلام

ڈاکٹر محمد حسین اکبر
سربراہ ادارہ منہاج الحسینؑ
جوہر ٹاؤن لاہور
یکم جنوری 2020ء

مقدمہ از مؤلف

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ الشیخ حسن بن موسیٰ الصفار

مقدمہ از مئولف

حجۃ الاسلام والمسلمین علامہ الشیخ حسن بن موسیٰ الصفار

جب آپ رات کے وقت کسی ایسے راستے پر سفر کریں جو دشوار گزار اور گہری کھائیوں اور گڑھوں سے بھرا ہو تو آپ کو چاند کی روشنی کی بہت زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے تا کہ آپ چاند کی روشنی کی مدد سے اس راستے پر چل سکیں اور اپنے آپ کو گہری کھائی اور گڑھے میں گرنے سے بچا سکیں۔

اگر آپ کی نگاہیں چاند کے سحر اور اس کے حسن و جمال میں گم سم ہو جائیں، خاص طور پر اگر وہ چودھویں کا چاند ہو تو آپ اپنی نگاہیں اس پر ہی ٹِکا لیں اور اسکے جادوئی منظر میں کھو جائیں اگر چہ اس سے آپ کافی لطف اندوز ہوں گے مگر یہ آپ کی نگاہوں کو راستے سے ہٹا سکتا ہے جس سے آپ گڑھے میں گر سکتے ہیں یا کسی چٹان سے ٹکرا سکتے ہیں جس سے آپ کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت بھی روشن چاند کی مانند ہے کہ ہم اپنی زندگی کو منور کرنے کیلئے ان کی سیرت کی روشن کرنوں کے محتاج ہیں ہم میں سے بعض افراد ان کی پاک سیرت کے حسن و جمال سے صرف فکری اور جذباتی طور پر وابستہ ہیں اور وہ ہدایت کے علمبردار آئمہ معصومین علیہم السلام کی شخصیات میں صرف اس قدر غرق

ہوتے ہیں کہ ان سے صرف اپنے احساسات اور جذبات کا رشتہ مضبوط کرتے ہیں لیکن انہوں نے ہمیں زندگی گزارنے کے لئے جو راستہ بتایا ہے اس راستے پر چلنے اور اس سے آگاہی حاصل کرنے میں غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں درپیش چیلنجز کا مقابلہ کرنے اور کھائیوں کو عبور کرنے کیلئے آئمہ معصومین علیہم السلام سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت و کردار میں پاکیزگی اور حسن و جمال کی بناء پر ان سے عشق اور محبت کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے لیکن یہ بات ہرگز درست نہیں کہ ہم ان سے ہدایت حاصل کرنے اور ان کی سیرت کی پیروی کرنے کی بجائے صرف ان سے محبت و عشق کرنے پر اکتفاء کریں۔ بلکہ انسان کیلئے ضروری ہے کہ ان کے مقدس جمال سے عشق اسے اس بات کی طرف لے جائے کہ وہ ان سے اپنی عملی زندگی میں ہدایت اور رہنمائی حاصل کرے اور ان کے نور کی روشنی میں فیض حاصل کرے۔

اہل بیت علیہم السلام سے جو روایات منقول ہیں ان میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ ہمارا اہل بیت علیہم السلام کے ساتھ ایسا تعلق قائم ہونا چاہیے جو ان کی اتباع اور اقتداء کرنے کے قانون پر قائم ہو، ان کیساتھ صرف جذباتی تعلق قائم نہ ہو۔ اگر اہل بیت علیہم السلام کو صرف دیوار پر لگی ہوئی خوبصورت پینٹنگز (Paintings) کی نظر سے دیکھا جائے کہ جن کے حسن و جمال میں ہم کھو جاتے ہیں اور اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں یا انہیں آثار قدیمہ کے کسی قیمتی پتھر کی مانند دیکھیں گے کہ جو میوزیم میں رکھا ہوتا ہے اور ہم اسے قیمتی مال و ثروت میں تولتے ہیں جبکہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہماری عملی زندگی میں اس کا ہم پر کیا اثر ہوگا۔ اہل بیت علیہم السلام کو اس زاویہ سے دیکھنے کا یہ مطلب ہے کہ ہم ان کی اس اہم ذمہ داری اور کردار سے جاہل ہیں اور

اس کا انکار کررہے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس پاکیزہ عترت واہل بیت علیہم السلام کو دیا ہے اور وہ اہم ذمہ داری امامت کا کردار اور انسان کی زندگی میں ہدایت ورہنمائی کا فریضہ ہے۔

بے شک اہل بیت علیہم السلام ہر مدح اور منقبت کے لائق ہیں اور یہ ہر فضیلت اور تکریم کے حقدار ہیں بلکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان کی ثناء بیان فرمائی ہے اور احادیث میں صادق وامین نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی توصیف اور تعریف بیان فرمائی ہے۔ جو چیز اہل بیت علیہم السلام کی خوشی کا باعث ہے وہ ان کے راستے کی معرفت حاصل کرنا اور ان کے طریقے پر چلنا اور ان کی پیروی کرنا ہے، صرف ان کی مدح سرائی کرکے اور ان کو فضائل پڑھ کر ان کی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ اہل بیت علیہم السلام نے جو ظلم برداشت کئے اور حاسدین کی طرف سے جو مصائب ومشکلات برداشت کیئے وہ فقط آنسو بہانے کیلئے نہیں تھے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو سربلند کرنے، عدل وانصاف کو پھیلانے، حق کو قائم کرنے اور اپنے بلند وبالا اہداف کو حاصل کرنے کیلئے ایک جہد مسلسل تھی۔

پس اہل بیت علیہم السلام کسی دنیاوی جاہ وچشم یا منصب اور عہدے کے متمنی نہیں تھے اور نہ آپ کوئی ایسا گروہ تھے جو خاص مفادات کیلئے کوشاں ہو بلکہ آپ عظیم پیغام کے علمبردار اور بلند وبالا اقدار کے مالک تھے جنہوں نے اپنی ساری زندگی رسالت کے پیغام کی خدمت گزاری اور بلند و بالا اخلاقی اقدار کیلئے وقف کررکھی تھی۔ آپ نے مختلف اجتماعی، معاشرتی اور سیاسی حالات کے تحت زندگی گزاری جو کہ تقریباً اڑھائی صدیوں کے زمانے پر مشتمل ہے اس تمام عرصے میں آپ نے اپنی سیرت اور کردار میں مختلف موقف اپنائے اگرچہ ان سب کا ہدف اور مقصد ایک تھا۔

بے شک آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا بنیادی ہدف دین اور امت اسلامیہ کی عام مصلحت اور بہتری کیلئے کردار ادا کرنا تھا لیکن آپؑ عملی طور پر ایسا موقف اپناتے تھے جس کا اجتماعی اور

معاشرتی حالات تقاضا کرتے تھے۔ اگر تمام آئمہ اہل بیت علیہم السلام ایک جیسا موقف اپنا تے تو یہ عقل و منطق کے برعکس تھا کیونکہ آپ خارجی حقائق کو دیکھ کر زمانے کے حالات کے مطابق اپنا موقف اپناتے تھے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی سیرت میں بھی یہی دیکھنے کو ملتا ہے ۔اگر آپ ایسا نہ کرتے تو دین کی خدمت کی فرصت کو ضائع کر دیتے جبکہ خدا کی طرف سے متعین کردہ امام ایسا ہرگز نہیں کرتا۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں سیاسی اور اجتماعی میدان میں مختلف موقف اور کردار سامنے آئے ہیں ان میں سے کچھ اماموں نے حکومت کی ذمہ داریوں کو اپنے کندھوں پر لیا اور کسی نے حکومت کو ٹھکرا کر صلح کی اور کسی نے حکومت کے مقابلے میں قیام کیا اور کسی نے حکومت سے منہ موڑ کر خاموشی سے زندگی گزاری اور کسی نے حکومت کی طرف سے ولی عہدی کا منصب قبول کیا اور کسی نے قید خانوں کی مشکلات اور گھر میں جبری اقامت کا سامنا کیا۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام میں سے کچھ کی سیرت میں علمی تحریک نمایاں نظر آتی ہے تو کچھ کی سیرت میں اخلاقی و ایمانی تربیت پر زیادہ زور دیا جاتا ہے کچھ کی سیرت میں فقراء اور مساکین کی ضروریات کو پورا کرنے کا خاص اہتمام نظر آتا ہے یعنی ایک خاص صفت ان کی سیرت اور عہد امامت میں زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ اس لئے ہماری یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ ہم اہلبیت علیہم السلام کی سیرت کا موضوعاتی اعتبار سے مطالعہ کریں اور ان کی زندگی کے ہر گوشے کی معرفت حاصل کریں تا کہ ہم ان کی سیرت کے بارے میں درست آگاہی اور صحیح سمجھ بوجھ حاصل کر سکیں۔

جب اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی سیرت میں تاریخی اعتبار سے ہر زمانے کے اعتبار اور حالات کی مناسبت سے موقف نظر آئے ہیں تو انسان کو اپنے زمانے کے سیاسی اور معاشرتی حالات میں کسی ایک موقف کو اپنا کر باقی سب کو ختم کر دینا اختلاف کا سبب بن سکتا ہے اس میں بہترین انداز یہ ہے کہ پہلے خارجی

حالات اور واقعات کی تشخیص کی جائے پھر ان حالات و واقعات کیلئے مناسب موقف اور لائحہ عمل اپنایا جائے۔ جب خارجی حالات اور واقعات کی تشخیص میں اختلاف واقع ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں اپنائے جانیوالے موقف اور لائحہ عمل میں بھی اختلاف نظر آتا ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی سوچ کے مطابق سیرت اہل بیت علیہم السلام اور دینی میراث سے اجمالی طور پر نتیجہ اخذ کر کے اپنے موقف کے درست ہونے پر دلیل پیش کرتا ہے لیکن اس صورت میں دوسرے کے موقف کو سراسر غلط نہیں کہہ سکتا جب تک اس کا موقف اصول اور اقدار میں اس سے موافقت رکھتا ہو اگرچہ خارجی حالات و واقعات کی تشخیص میں دونوں میں اختلاف ہوتا ہے۔

پس اس بات میں اختلاف نہیں ہے کہ انقلاب اور قیام کا راستہ اپنانا اور صلح کا راستہ اپنانا، یہ دونوں جائز اور شریعت میں ان کی اجازت موجود ہے اور دونوں دین میں ایک اصول کے طور پر مذکور ہیں اور سیرت اہل بیت علیہم السلام میں یہ دونوں راستے نظر آتے ہیں لیکن اختلاف خارجی حالات و واقعات کی تشخیص کرنے میں ہوتا ہے کہ جس کے بعد ان حالات و واقعات سے مناسبت رکھنے والا موقف اپنایا جاتا ہے۔ بعض اوقات آئمہ اہل بیت علیہم السلام پر ان کے زمانوں میں ان کے سیاسی موقف پر لوگ اعتراض کرتے تھے تو آپؑ اعتراض کرنیوالوں کے سامنے حالات و واقعات کی تشخیص کر کے اپنی رائے بیان کرتے اور ان پر واضح کرتے کہ ان حالات میں ان کی طرف سے اس موقف کو اپنانے کا تقاضا ہونا چاہیے کہ جو موقف آپؑ نے اپنایا ہے۔

جیسا کہ امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ صلح پر اعتراض کرنے والوں کو جواب دیا اور حضرت امام حسین علیہ السلام نے ان لوگوں کے اعتراضات کے جواب دیئے جو آپؑ کو عراق کی طرف نہ جانے اور بنو امیہ کی حکومت کے خلاف قیام نہ کرنے کی تلقین کر رہے تھے، اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان لوگوں کی باتوں کے جواب دیئے جو آپؑ کو

ان انقلابی تحریکوں میں شامل ہونے کی دعوت دے رہے تھے جو بنوامیہ کے خلاف اور بنو عباس کے حق میں قیام کر رہی تھیں۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے ان جوابات میں اس حوالے سے کوئی بحث کی گنجائش نہیں کہ آپؑ جہد مسلسل کے قائل تھے اور ظلم کا انکار کرتے تھے اور اس میں عام لوگوں کی مصلحت اور ضروریات کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ اپنے بلند اصولوں کی پاسداری کرتے تھے۔ دراصل گفتگو اس حوالے سے ہے کہ آپؑ کے زمانے کے حالات و واقعات کس موقف اور لائحہ عمل کا تقاضا کرتے تھے اس حوالے سے واضح مثال کے طور پر ہم وہ روایت بیان کرتے ہیں جو شیخ کلینیؒ نے اپنی کتاب ''الکافی ج ۵ ص ۱۹'' پر عبدالملک بن عمر سے نقل کی ہے کہ وہ بیان کرتا ہے:

''میں نے ابوعبداللہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے عرض کیا: زیدیہ فرقے کے پیروکار یہ کہتے ہیں کہ ہمارے اور جعفر کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے سوائے اس بات پر کہ ان کے نزدیک جہاد فرض نہیں ہے، اس پر آپؑ نے فرمایا: کیا میں جہاد کو فرض نہیں سمجھتا ؟ اللہ کی قسم میرے نزدیک جہاد فرض ہے لیکن اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ اپنے علم کو ان لوگوں کی جہالت کے ساتھ قرار دوں''

یوں امام جعفر صادق علیہ السلام اس بات کو واضح فرما رہے ہیں کہ ان کا جہاد کے موقف پر زیدیہ فرقہ کے لوگوں کیساتھ اختلاف نہیں ہے لیکن آپؑ ان خارجی حالات اور واقعات کو بہتر جانتے ہیں جو جہاد کے فرض ہونے کا تقاضا کرتے ہیں جبکہ زیدیہ فرقہ کے پیروکار اس سے جاہل ہیں۔

اس کتاب کا مطالعہ کرنے والے کے سامنے جو صفحات ہیں اس پر ایسے کلمات ہیں جو میں نے مختلف اوقات میں اہل بیت علیہم السلام کی ولادت و شہادت کی مناسبت سے محافل و مجالس کے تحت تحریر کئے ہیں۔

یہ کتاب ان سابقہ تحریر کی گئی کتابوں کے ساتھ مکمل ہوتی ہے جو میں نے آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت مبارکہ کے حوالے سے تحریر کی ہیں۔ میری سابقہ کتابوں میں کتاب ''آئمہ اہل البیت رسالۃ و جہاد'' اور ''الامام الحسینؑ مسئولیۃ الثورۃ'' اور ''الثائر والسجن دراسۃ فی حیاۃ الامام موسیٰ الکاظمؑ'' اور ان کے علاوہ دیگر کتابچے ہیں جن کی اللہ نے مجھے طباعت اور نشر کرنے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور یہ کتابچے حضرت امام علی علیہ السلام، امام حسن علیہ السلام، امام حسین علیہ السلام، عقیلہ بنی ہاشم حضرت زینب سلام اللہ علیہا اور حضرت امام مہدی علیہ السلام کے متعلق تحریر کئے گئے ہیں۔

میں نے جو بھی کتابچہ تحریر کیا ہے اس میں اہلبیت علیہم السلام کی ہدایت اور سیرت کی روشنی میں رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کی اور میں نے اپنے اردگرد کے معاشرے کے حالات کے مطابق اس کو سمجھنے کی جستجو اور سعی کی ہے جو کہ میں نے خارجی حالات و واقعات کو سمجھ کر اس کے تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر اپنی اجتہادی کوشش کے تحت نتائج اخذ کئے ہیں۔

میں اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اہل بیت علیہم السلام کی محبت پر استقامت اور ثابت قدمی عطا فرمائے اور مجھے ان کی ہدایت کے راستے پر گامزن فرمائے اور ان کے عظیم پیغام کا مسلسل پرچار کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور قیامت کے دن مجھے ان کے ہمراہ محشور فرمائے۔ آمین

والحمدللہ رب العالمین

حسن بن موسیٰ الصفار

25 جمادی الثانی 1430ھ

فرمان حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام

''اَیۡنَ الَّذِیۡنَ زَعَمُوۡا اَنَّھُمُ ﴿الرَّاسِخُوۡنَ فِی الۡعِلۡمِ﴾ دُوۡنَنَا، کَذِبًا وَّ بَغۡیاً عَلَیۡنَا، اَنۡ رَّفَعَنَا اللّٰہُ وَ وَضَعَھُمۡ، وَ اَعۡطَانَا وَ حَرَمَھُمۡ، وَ اَدۡخَلَنَا وَ اَخۡرَجَھُمۡ، بِنَا یُسۡتَعۡطَی الۡھُدٰی، وَ یُسۡتَجۡلَی الۡعَمیٰ.

اِنَّ اۡلاَئِمَّۃَ مِنۡ قُرَیۡشٍ غُرِسُوۡا فِیۡ ھٰذَا الۡبَطۡنِ مِنۡ ھَاشِمٍ، لَا تَصۡلُحُ عَلٰی سِوَاھُمۡ، وَ لَا تَصۡلُحُ الۡوُلَاۃُ مِنۡ غَیۡرِھُمۡ.''

''کہاں ہیں وہ لوگ کہ جو جھوٹ بولتے ہوئے اور ہم پر ستم روا رکھتے ہوئے یہ ادّعا کرتے ہیں کہ وہ راسخون فی العلم ہیں نہ ہم؟ چونکہ اللہ نے ہم کو بلند کیا ہے اور انہیں گرایا ہے اور ہمیں (منصب امامت) دیا ہے اور انہیں محروم رکھا ہے اور ہمیں (منزل علم میں) داخل کیا ہے اور انہیں دور کر دیا ہے۔ ہم ہی سے ہدایت کی طلب اور گمراہی کی تاریکیوں کو چھانٹنے کی خواہش کی جاسکتی ہے۔

بلا شبہ امام قریش میں سے ہوں گے جو اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنی ہاشم کی کشت زار سے ابھریں گے۔ نہ امامت کسی اور کو زیب دیتی ہے اور نہ ان کے علاوہ کوئی اس کا اہل ہوسکتا ہے''

(خطبہ ۱۴۲۔ نہج البلاغہ)

مقام اہل بیت علیہم السلام

مقام اہل بیت علیہم السلام

یہ ایک فطری امر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت اطہار علیہم السلام امتِ اسلامیہ کے دلوں میں بلند مقام و مرتبہ رکھتے ہوں اور تمام مسلمانوں کے دل ان سے وابستہ ہوں۔ اس کی کئی وجوہات اور اسباب ہیں جن میں سے اہم اسباب درج ذیل ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابتداری

اہل بیت علیہم السلام کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص تعلق اور واسطہ ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاندان اور ذریت ہونا ہے۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ انسانوں کا آپس میں جو تعلق ہوتا ہے وہ اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس کے خاندان، نسل اور اولاد کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں اگر کوئی شخص کسی کی قدر و منزلت کا قائل ہو اور وہ لوگوں کے نزدیک معزز ہو تو اس کی قدر و منزلت اور عزت کا عکس اس کے خاندان و نسل پر بھی ہوتا ہے جب لوگ کسی سے محبت کرتے ہیں تو اس کی طرف کھینچے چلے جاتے ہیں اور اس کی تعظیم کرتے ہیں اور یہ چیز لوگوں کو مجبور کر دیتی ہے کہ اس شخص سے وابستہ تمام افراد یا اس کے قرابت داروں سے بھی محبت کی جائے کیونکہ ایسا کرنے سے ہی لوگوں کی اپنے محبوب سے محبت اور وفا کا اظہار ہوگا۔

ایسا ہونا ایک فطری اور وجدانی امر ہے جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ایسے ہی آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراء سلام اللہ علیہا نے اپنے

مشہور خطبہ میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''**المرء یحفظ فی ولدہ**''(۱) ''کسی شخص کا احترام اس کی اولاد میں بھی محفوظ ہوتا ہے'' (یعنی اس کے احترام کی وجہ سے اس کی اولاد کا احترام بھی ہوتا ہے)

اس حقیقت کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مقدسہ ہر مسلمان کے نزدیک محبوب ترین، انتہائی قیمتی اور معزز ترین ہستی ہے۔ ہر مسلمان کا دل آپؐ پر ایمان وایقان سے دھڑکتا ہے۔ پس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس عظیم محبت وعقیدت کا عکس یوں ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں کے دلوں میں آپؐ کی آلؑ اور عترت کی محبت جاگزیں ہو اور وہ آپؐ کے اہلبیت علیہم السلام اور اولاد کی تعظیم وتوقیر کریں۔

ابن عباس سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''**اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ بِہٖ مِنْ نِعَمِہٖ، وَاَحِبُّوْنِیْ لِحُبِّ اللّٰہِ، وَاَحِبُّوْا اَھْلَ بَیْتِیْ لِحُبِّیْ**''

''اللہ سے محبت کرو کیونکہ اس نے تم کو نعمتوں سے سرفراز کیا ہے اور مجھ سے اللہ کی محبت کی وجہ سے محبت کرو اور میرے اہل بیت علیہم السلام سے میری محبت کی وجہ سے محبت کرو۔''

حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب ''**المستدرک علی الصحیحین**'' میں اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس حدیث کی تمام اسناد صحیح ہیں۔(۲)

مسلمانوں کی اپنے نبیؐ سے محبت وعقیدت انہیں اس بات کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے کہ وہ نبیؐ سے منسوب اور وابستہ ہر نشانی کا خاص خیال رکھیں تو اس صورت میں نبیؐ کی ذریت

۱۔ محمد باقر مجلسی، بحار الانوار ج39 ص227 تیسرا ایڈیشن 1983ء (بیروت۔ دار الاحیاء التراث العربی)

۲۔ محمد بن عبداللہ حاکم نیشاپوری، المستدرک علی **الصحیحین** حدیث نمبر 4716۔
پہلا ایڈیشن 1411ھ (بیروت: دار الکتب العلمیہ)

اور عترت کا کس قدر خیال رکھنا چاہیے اور ان کے متعلق کتنی عزت و توقیر اپنے دل میں بسانی چاہیے کیونکہ یہ ہستیاں نبیؐ کی زندہ نشانیاں اور ان کا خون اور گوشت ہیں؟

مصر کی یونیورسٹی ''جامعہ اسکندریہ'' میں تاریخ مصر اور قدیمی مشرق ادنیٰ کے پروفیسر ڈاکٹر محمد ہیومی مہران جو کہ ایک محقق اور ریسرچر ہیں اور وہ کئی علمی کمیٹیوں اور تنظیموں کے رکن بھی ہیں وہ 1973ء سے 1977ء تک سعودی عرب کے شہر ریاض میں واقع یونیورسٹی ''جامعہ الامام محمد بن سعود الاسلامیہ'' میں پروفیسر رہے پھر وہ مکہ مکرمہ میں واقع ام القریٰ یونیورسٹی میں 1983ء سے 1987ء تک پروفیسر رہے ہیں وہ اپنی کتاب ''الامامت واہل بیتؑ'' میں درج ذیل قصہ تحریر کرتے ہیں:

ابن شہر آشوب اپنی کتاب ''المناقب'' میں بیان کرتا ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی خدمت میں دروس سننے کیلئے آئے کہ آپ نے ایک عصاء کا سہارا لے رکھا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر امام ابوحنیفہ نے کہا: اے فرزند رسول! ابھی آپ عمر کے اس حصے میں نہیں پہنچے کہ جب انسان کو عصاء کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا۔ ہاں بالکل ایسا ہی ہے لیکن میں نے یہ عصا اس لئے تھام رکھا ہے کیونکہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عصا ہے اور میں اس سے خیر و برکت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

یہ سن کر ابوحنیفہ تیزی سے آگے بڑھے اور کہا: اے فرزند رسول اللہؐ! کیا میں اس عصا کو بوسہ دے لوں؟ تو ابوعبداللہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے انہیں اپنے دونوں ہاتھوں سے پیچھے دھکیلتے ہوئے فرمایا۔ خدا کی قسم تم بخوبی جانتے ہو کہ یہ جلد اللہ کے رسول کی جلد ہے اور یہ بال اللہ کے رسولؐ کے بال ہیں لیکن پھر بھی تم نے اس جلد اور بال کو بوسہ نہیں دیا اور عصا کو چومنا چاہتے ہو؟؟؟(۱)

۱۔ محمد ہیومی مہران، الامامت واہل بیت، جلد 1 صفحہ 25، 1995ء (بیروت: دار النھضۃ العربیۃ)

امت اسلامیہ نے نسل در نسل کئی احادیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نقل کی ہیں جس میں اس بات کی یاد دہانی اور تاکید کی گئی ہے کہ اہل بیت اطہار علیہم السلام کی شخصیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کا حصہ ہیں۔

جیسا کہ بخاری نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا کے متعلق یہ حدیث تحریر کی ہے۔

''فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِّنِّیْ فَمَنْ اَغْضَبَهَا اَغْضَبَنِیْ''

''فاطمہؑ میرا ٹکڑا ہے جس نے اِسے غضبناک کیا اس نے مجھے غضب ناک کیا ہے''(۱)

لسان العرب میں مذکور ہے کہ اس کا یہ مطلب ہے کہ فاطمہؑ میرا جز ہیں جیسا کہ گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے۔(۲)

اور آپ نے حضرت علی علیہ السلام کے متعلق فرمایا جیسا کہ بخاری نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے:

''اَنْتَ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْکَ (۳) (علیؑ) تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں''

جیسا کہ احمد بن حنبل نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے حق میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث نقل کی ہے کہ آپ نے فرمایا:

''حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْ حُسَیْنٍ ، اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا' (۴)

حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں، اللہ اس سے محبت کرتا ہے جو حسینؑ سے محبت کرتا ہے۔''

۱۔ محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری، باب مناقب فاطمہؑ حدیث 3767 (بیروت: دار الکتب العلمیہ)

۲۔ ابن منظور، لسان العرب، جلد ۱، صفحہ 222، 1998ء (بیروت: دار الجیل و دار السان العرب)

۳۔ صحیح البخاری، باب مناقب علی ابن ابی طالبؑ صفحہ 466

۴۔ احمد بن حنبل، مسند الامام احمد بن حنبل، حدیث 17704 پہلا ایڈیشن 1998ء (بیروت: عالم الکتب)

یہ احادیث اور ان جیسی کئی احادیث اہل بیت علیہم السلام کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تعلق اور فطری تعلق کو بیان کرتی ہیں اور یہ تعلق و واسطہ لوگوں کو اہل بیت علیہم السلام کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے۔ اس بنیاد پر مسلمان اہل بیت رسول علیہم السلام کے ساتھ خاص اور جداگانہ محبت رکھتے ہیں یہاں تک کہ بخاری نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا سے فدک چھیننے اور ان کا خلیفہ اول سے ناراض ہونے پر ان سے معافی مانگی اور یہ کہا:

''وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لِقَرَابَةِ رَسُوْلُ اللّٰہِ اَحَبُّ اِلَّی اَنْ اَصِلَ مِنْ قَرَابَتِیْ''

اس ذات کی قسم جسکے قبضہ قدرت میں میری جان ہے، مجھے اپنی قرابت داری ورشتہ داری سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت داری ورشتہ داری عزیز ہے۔''(۱)

شرعی نصوص

مسلمان خود کو قرآن مجید اور سنت مطہرہ کا پیروکار سمجھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی اتباع، اسکے تقرب اور خوشنودی کی خاطر قرآن وسنت کے مطابق عمل کرتا ہے۔ ایک مسلمان شخص اس بنیاد پر قرآن وسنت پر عمل کرتا ہے کیونکہ اسلام کا مطلب ہی یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا جائے اور اسکے آگے عبودیت و بندگی کا اظہار کیا جائے۔

اسی طرح مسلمان یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم انسان کیلئے دنیا وآخرت میں مصلحت اور فائدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ جب کسی موضوع پر متعدد شرعی نصوص موجود ہوں اور کئی متواتر احادیث ذکر کی گئی ہوں تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اس موضوع کو خاص اہمیت حاصل ہے اور خدا کی طرف سے اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے تا کہ ایک مسلم فرد کو اس موضوع پر بے حد رغبت اور شوق دلایا جائے اور وہ اس کو مکمل طور پر سنجیدگی اور اہتمام سے اپنائے۔

۱۔ صحیح البخاری، باب غزوۃ خیبر، حدیث 4241

اسی وجہ سے بہت سی ثابت شدہ صحیح شرعی نصوص (آیات واحادیث) میں اہل بیت علیہم السلام کی فضیلت اور خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک ان کی قدر ومنزلت اور امت پر ان کے حقوق کو بیان کر کے مومنوں کے لئے اہل بیت علیہم السلام کی گہری ولاء کو قائم کرنے کیلئے ایک تمہید اور زمین ہموار کی گئی ہے۔ یہ آیات وروایات امت مسلمہ کے دلوں میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عترت واہل بیت علیہم السلام کی محبت اور عشق کو مضبوط کرتی ہیں۔

یہ بات درست ہے کہ ایسی شرعی نصوص بھی موجود ہیں جو اصحاب کی فضیلت، قدر ومنزلت اور انکے بلند جہادی موقف کو بیان کرتی ہیں لیکن وہ روایات اجمالی طور پر ان روایات کا مقابلہ نہیں کرسکتیں جو اہلبیت علیہم السلام کی شان میں بیان ہوئی ہیں۔ یہ روایات کمیت اور سند کے اعتبار سے اہلبیت علیہم السلام کی شان میں وارد روایات سے کمتر اور کمزور ہیں اور یہ مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے بھی ان روایات کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

اہل بیت علیہم السلام کی شان میں وارد ان نصوص کی تعداد کافی زیادہ ہے اور ان میں سے زیادہ تر ایسی روایات ہیں جن پر تمام شیعہ سنی مسلمانوں کا اتفاق ہے اور وہ ان روایات کو قابل قبول قرار دیتے ہوئے ان کی سند کو درست قرار دیتے ہیں۔ ان شرعی نصوص میں اہل بیت علیہم السلام اطہار کا خاص مقام ان کی افضلیت، ان کے اتباع کے وجوب، ان سے متمسک اور وابستہ رہنے کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔

ہم یہاں واضح مثال کے طور پر اس بات کو بیان کرتے ہیں جو حاکم نیشاپوری نے اپنی کتاب ''المستدرک'' میں امام احمد بن حنبل کے حوالے سے یہ جملہ تحریر کیا ہے کہ امام حمد بن حنبل نے یہ کہا ہے کہ اصحابِ رسولؐ میں سے کسی صحابی کی شان میں اتنے فضائل بیان نہیں ہوئے ہیں جتنے حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی شان میں بیان ہوئے ہیں۔(۱)

قاضی اسماعیل، امام نسائی اور ابوعلی نیشاپوری نے یہ بیان کیا ہے کہ ''کسی صحابی کی شان

۱۔ المستدرك على الصحيحين ،مناقب امیر المومنین علی علیہ السلام حدیث نمبر 4572

میں صحیح اسناد کے ساتھ اس قدر احادیث مروی نہیں ہیں جس قدر کہ صحیح اسناد کے ساتھ احادیث حضرت علی علیہ السلام کی شان میں مروی ہیں۔''(۱)

ابن عساکر نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ابن عباس نے کہا:

''جس قدر اللہ کی کتاب (قرآن مجید) میں حضرت علی علیہ السلام کی شان میں آیات نازل ہوئی ہیں اتنی آیات اور کسی کی شان میں نازل نہیں ہوئیں''(۲)

شرعی نصوص میں قرآن مجید میں کئی ایسی آیات موجود ہیں جنکے بارے میں تمام مسلمان علماء کا اتفاق ہے کہ یہ آیات اہل بیت علیہم السلام کی شان میں نازل ہوئی ہیں۔ان میں سے چند آیات اور روایات درج ذیل ہیں۔

آیت مباہلہ

اس آیت میں پروردگار کا ارشاد ہوتا ہے۔

''فَمَنْ حَاجَّکَ فِیْهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ کَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْ عُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ کُمْ وَ نِسَاءَ نَا وَ نِسَاءَ کُم وَ اَنْفُسَنَا وَ اَنْفُسَکُمْ ،ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَةَ اللّٰهِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ''

''جو علم و برہان کے آجانے کے بعد آپ سے جھگڑا کرتا ہو تو اسے کہو آؤ ہم اپنے بیٹے بلائیں اور تم اپنے بیٹے بلاؤ، ہم اپنی عورتیں بلائیں اور تم اپنی عورتیں بلاؤ ہم اپنی جانوں کو بلائیں اور تم اپنی جانوں کو بلاؤ پھر ہم سب مل کر (اللہ کی بارگاہ میں) گڑگڑائیں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں''(۳)

یہ آیت کریمہ اس وقت نازل ہوئی جب نجران کے عیسائیوں کا وفد نبی اکرم صلی اللہ علیہ

۱۔ احمد بن محمد بن حجر الھیثمی، الصواعق المحرقۃ، جلد 2 صفحہ 353 پہلا ایڈیشن 1997ء (بیروت: موسسہ الرسالہ)

۱۔ سابق مصدر صفحہ 373

۳۔ سورہ آل عمران آیت 61

وآلہ وسلم سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مناظرہ کرنے کیلئے مدینہ منورہ آیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ حکم دیا کہ اگر یہ نصاریٰ نجران حق بات کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں تو انہیں مباہلہ کرنے کی دعوت دیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس حالت میں مباہلہ کرنے کیلئے مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے کہ آپؐ کے ہمراہ فقط حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ، حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ علیہم السلام تھے اور درج بالا آیت کریمہ کی عملی تفسیر دکھانے کیلئے ''اَبْنَاءَ نَا'' کی تفسیر حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام اور ''نِسَاءَ نَا'' کی تفسیر حضرت فاطمہ علیہا السلام، اور ''اَنْفُسَنَا'' کی تفسیر حضرت علی علیہ السلام بن کر جا رہے تھے۔

جمہور مفسرین، سیرت نبوی کے مورخین اور آئمہ حدیث نے اس آیت کی درج بالا تفسیر ذکر کی ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں سعد بن ابی وقاص سے منقول ہے کہ جب یہ آیات ''فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ کُمْ'' نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کو بلایا اور فرمایا ''اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلِیْ''

''اے اللہ! یہ ہستیاں میری اہل بیتؑ ہیں''(۱)

آیت تطہیر

اس آیت میں پروردگار کا ارشاد ہوتا ہے:

''اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا''

''بے شک اللہ کا تم اہل بیت علیہم السلام کے متعلق یہ ارادہ ہے کہ تم سے رجس کو دور رکھے

۱۔ مسلم بن حجاج قشیری نیشاپوری، صحیح مسلم کتاب فضائل الصحابہ، حدیث نمبر 32، پہلا ایڈیشن 1998ء (ریاض: دار المغنی)

اورتم کوایسے پاک رکھے جیسے پاک رکھنے کا حق ہے‘‘(۱)

ابن تیمیہ بیان کرتا ہے کہ امام حمد بن حنبل اور ترمذی وغیرہ نے ام المومنین حضرت اُم سلمہؓ سے روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت (آیت تطہیر) نازل ہوئی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی چادر حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ سلام اللہ علیہا، حضرت حسن علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام پر اوڑھانے کے بعد فرمایا:

’’اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلاَءِ اَھْلُ بَیْتِیْ فَاذْھِبْ عَنْھُمُ الرِّجْسَ وَ طَھِّرْھُمْ تَطْھِیْرًا‘‘

’’اے اللہ! یہ ہستیاں میری اہل بیت علیہم السلام ہیں پس تو ان سے رجس کو دور رکھ اور انہیں ایسے پاک رکھ جیسے پاک رکھنے کا حق ہوتا ہے‘‘

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت، اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی تفسیر اور وضاحت بیان کرتی ہے۔ پس جب آپؐ نے یہ فرمایا۔ ’’یہ میرے اہلبیت علیہم السلام ہیں‘‘ حالانکہ قرآن مجید میں اس آیت کا سیاق وسباق دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہاں پر نبیؐ کی بیویوں سے خطاب ہو رہا تھا اور اگر اس آیت تطہیر میں غور کیا جائے تو یہ آشکار ہوتا ہے کہ اگرچہ نبیؐ کی ازواج اہل بیت علیہم السلام میں داخل ہیں جیسا کہ قرآن مجید کی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں مگر پھر بھی ان شخصیات کا زیادہ حق ہے کہ وہ اہل بیت علیہم السلام میں داخل ہوں کیونکہ نسب سے قائم ہونے والا تعلق، رشتہ ازدواج کے ذریعے قائم ہونے والے تعلق سے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتا ہے۔

جب اللہ سبحانہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا کہ اس کا یہ ارادہ ہے کہ وہ نبیؐ کے اہل بیت علیہم السلام سے رجس کو دور اور حقیقی معنوں میں پاک رکھے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خاندان میں سے اپنے سب سے قریبی اور عظیم ترین خاص ہستیوں یعنی حضرت علی علیہ السلام، حضرت فاطمہ علیہا السلام اور جوانان جنت کے سردار (حضرت حسنؑ و

۱۔ سورہ الاحزاب، آیت 33

حضرت حسین علیہم السلام) کو بلایا اور اللہ سے ان کے بارے میں ہی تطہیر کی دعا مانگی تھی اور یہ عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اہلبیت علیہ السلام سے رجس کو دور اور حقیقی معنوں میں پاک رکھنا اللہ کی طرف سے ایک نعمت ہے تا کہ وہ اس خاص نعمت سے ان مقدس ہستیوں کو رنگ دے اور یہ اللہ کی طرف سے ان پر ایسی رحمت اور فضل ہے کہ جس تک وہ اپنی قوت و طاقت سے رسائی حاصل نہیں کر سکتے تھے۔(۱)

آیت مودت

اس آیت میں پروردگار کا ارشاد ہوتا ہے:

''قُلْ لاَ اَسْئَالُکُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِیْ الْقُرْبیٰ''

''(اے نبیؐ) کہہ دیجئے میں اس (کارِ رسالت) پر تم لوگوں سے اس کے سوا کوئی اجرت نہیں مانگتا کہ تم صرف میرے قرابتداروں سے مودت کرو''(۲)

ابن حجر الھیثمی بیان کرتا ہے کہ احمد، طبرانی، ابن ابی حاتم اور حاکم نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحاب نے آپؐ سے پوچھا: یارسول اللہؐ! آپؐ کے وہ کون سے قرابتدار ہیں جن کی مودت اللہ نے ہم پر واجب فرمائی ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: وہ علی علیہ السلام، فاطمہ علیہا السلام اور ان کے دو بیٹے ہیں۔(۳)

۱۔ تقی الدین احمد بن تیمیہ۔حقوق آل البیت، صفحہ 27-25 (بیروت: دار الکتب العلمیہ، تحقیق: عبدالقادر عطاء)
نوٹ: درج بالا نظریہ اس بات کو قوی قرار دیتا ہے کہ آیت تطہیر جن ہستیوں کی شان میں نازل ہوئی وہ صرف اہل کساء تھے جن میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ حضرت فاطمہؑ، حضرت علیؑ اور حسنین شریفینؑ شامل تھے۔ابن تیمیہ کا ازواج کو اہلبیت میں داخل کرنے کی ناکام کوشش اس حدیث سے رد ہوتی ہے کہ جب حضرت ام سلمہؓ نے چادر میں آنے کی کوشش کی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: آپ خیر و بھلائی پر ہیں مگر انہیں چادر میں داخل نہ ہونے دیا۔(مترجم)

۲۔ سورہ شوریٰ آیت 23

۳۔ الصواعق المحرقۃ جلد 2 صفحہ 487

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو احادیث اہل بیت علیہم السلام کی فضیلت میں ارشاد فرمائی ہیں تاکہ اس کے ذریعے امت مسلمہ کو ان سے ہدایت لینے اور متمسک رہنے پر ابھار سکیں ان کی تعداد کافی زیادہ ہے جو کہ اہلسنت اور اہل تشیع کی احادیث کی کتب کی طرف رجوع کر کے ان احادیث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ بعض اہلسنت حفاظ اور محدثین نے الگ سے ایسی خاص کتب تالیف کی ہیں جو عام طور پر اہل بیت علیہم السلام کی شان میں ہیں یا خاص طور پر اہل بیت علیہم السلام کی بعض شخصیات کے متعلق ہیں مثلاً ان کتابوں میں اہلسنت کے علماء میں سے امام طبری مکی (694ھ ۔615ھ) نے ''ذخائر العقبیٰ فی مناقب ذوی القربیٰ''، حافظ سبط ابن جوزی حنفی (654ھ۔215ھ) کی ''خصائص امیر المومنین علی ابن ابی طالبؑ ''وغیرہ شامل ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو احادیث اہل بیت علیہم السلام کی شان میں بیان فرمائی ہیں ان میں سر فہرست درج ذیل احادیث ہیں۔

حدیث سفینہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مَثَلُ اَهلُ بَیتِی فِیکُم مِثلُ سَفِینَةَ نُوحٍ مَن رَکَبهَا نَجا وَ مَن تَخَلَّفَ عَنهَا غَرِقَ ''

''تم میں میرے اہل بیت علیہم السلام کی مثال کشتی نوح جیسی ہے جو اس پر سوار ہوا وہ نجات پا گیا اور جو اس سے پیچھے رہا وہ غرق ہو گیا''(۱)

اس حدیث کو حاکم نیشاپوری نے ''المستدرک'' اور ھیثمی نے ''مجمع الزوائد'' اور حافظ طبری نے ''ذخائر العقبیٰ'' میں ذکر کیا ہے۔

۱۔ المستدرک علی الصحیحین، حدیث3312

حدیث ثقلین

اس حدیث کو کئی صحیح طرق سے بیان کیا گیا ہے جیسا کہ مسلم نے اپنی کتاب ''صحیح مسلم'' میں زید بن ارقم سے یہ حدیث نقل کی ہے کہ:

''قَامَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَوْمًا فِیْنَا خَطِیْباً ، بِمَاءٍ یُدْعَیٰ خُماً، بَیْنَ مَکَّۃَ وَالْمَدِیْنَۃَ، فَحَمِدَ اللّٰہُ وَاُثْنِیْ عَلَیْہِ ، وَوَعَظَ وَ ذَکَرَ، ثُمَّ قَالَ : (اَمَّا بَعْدُ، اَلاَ اَیُّھَا النَّاسُ! فَاِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ یُوْشَکُ اَنْ یَاتِیَ رَسُوْلَ رَبِّیْ فَاَجِیْبُ ، وَ اَنَا تَارِکٌ فِیْکُمْ ثَقَلَیْنِ: اَوَّلُھُمَا کِتَابَ اللّٰہِ، فِیْہِ الْھُدیٰ وَ النُّوْرِ، فَخُذُوْا بِکِتَابِ اللّٰہِ ، وَاسْتَمْسَکُوْا بِہٖ فَحَثَّ عَلَی کِتَابَ اللّٰہِ وَ رَغَبَ فِیْہِ . ثُمَّ قَالَ : وَاَھْلُ بَیْتِیْ ، اَذْکُرُکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ ، اَذْکُرُکُمَ اللّٰہُ فِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ ، اَذْکُرُکُمُ اللّٰہُ فِیْ اَھْلُ بَیْتِیْ ''(۱)

''ایک روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کے تالاب کے نزدیک کھڑے ہوئے اور اس تالاب کا نام خم ہے اور وہاں پر آپؐ نے خطبہ دیا اس خطبہ میں حمد و ثناء الٰہی اور وعظ و نصیحت کے بعد فرمایا: اے لوگو! میں بھی ایک انسان ہوں اور بہت جلد اللہ کا فرشتہ میری روح قبض کرنے کیلئے آئے گا اور مجھے لبیک کہنا پڑے گا میں تمہارے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں سے ایک اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور نور ہے لہٰذا اللہ کی کتاب سے وابستہ رہنا۔ پیغمبر اکرمؐ نے کتاب خدا کی بہت زیادہ سفارش اور تاکید کی اور اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلائی اس کے بعد فرمایا: اور میرے اہل بیت علیہم السلام، میں تمہیں اپنے اہلبیت علیہم السلام کی سفارش اور تاکید کرتا ہوں اور اس جملے کو آپؐ نے تین مرتبہ دہرایا۔''

ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب ''سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ'' میں حدیث نمبر 1767، ترمذی کے الفاظ کو ذکر کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبداللہ سے مروی ہے۔

۱۔ صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابہ، حدیث 2408

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''یَا اَیُّھَا النَّاسُ ! اِنِّیْ قَدْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ مَا اَنْ اَخَذْتُمْ بِہٖ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰہِ وَ عِتْرَتِیْ اَھْلُ بَیْتِی''(۱)

''اے لوگو! میں تم میں وہ چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم ان سے وابستہ رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یہ اللہ کی کتاب اور میری عترت واہلبیتؑ ہے۔''

ناصر الدین البانی نے اپنی کتاب میں اس حدیث کو صحیح ثابت کیا ہے اور اس نے اس حوالے سے دیگر صحیح احادیث سے اس کی صحت پر کئی شواہد ذکر کئے ہیں۔

یہ احادیث اور اس جیسی دیگر احادیث لوگوں کے دلوں میں اہل بیت علیہم السلام کی محبت پیدا کرتی ہیں اور مومنوں کو ان کی ولایت پر استقامت عطا کرتی ہیں اور انہیں اہل بیت علیہم السلام کی پیروی کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔

اہل بیت علیہم السلام کی علمی برتری

استعداد اور قابلیت کی بناء پر کسی کا احترام اور اہتمام کیا جاتا ہے۔ اہل بیت علیہم السلام بلند و برتر علمی استعداد و قابلیت کے مالک ہیں امت اسلامیہ کے علماء اعلام ان کے علوم سے سیراب ہوتے ہیں اور مختلف مصائب ومشکلات میں خلفاء ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور جمہور امت کی رائے یہ ہے کہ اہل بیت علیہم السلام ایک قابل اعتماد علمی مرجعیت کا درجہ رکھتے ہیں۔

سید ابوالحسن ندوی نے اپنی کتاب ''المرتضیٰ'' میں بیان کیا ہے کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب مشکل امور میں حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی طرف رجوع کرتے تھے۔ وہ تحریر کرتے ہیں' حضرت علی علیہ السلام ہمارے خلیفہ حضرت عمر کیلئے ایک ناصح اور امین تھے۔ آپؑ مشکلات

۱۔ محمد ناصر الدین البانی، سلسلہ الاحادیث الصحیحۃ، جلد 4، صفحہ 355، پہلا ایڈیشن 1983ء، (کویت: الدار السّلفیہ، اردن: مکتبہ اسلامیہ)

میں علم وحکمت سے فیصلہ کرتے اور مشکلات کی گرہ کھول دیتے اور شبہات کو دور کر دیتے تھے یہاں تک کہ حضرت عمر کو یہ کہنا پڑا ''لَوْلَا عَلِیٌّ لَهَلَکَ عُمَرُ ''یعنی اگر علیؑ نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔ اسلامی تاریخ وادب میں حضرت عمر کا یہ جملہ بھی درج ہے۔'' لَا اَبْقَانِیَ اللّٰهُ لِمَعْضَلَةٍ لَیْسَ لَهَا اَبُوالْحَسَنَ ''مجھے کوئی ایسا مشکل درپیش نہ ہو کہ جس کو حل کرنے کیلئے میرے پاس ابوالحسنؑ (حضرت علیؑ) نہ ہو اور نبی پاکؐ سے مروی ہے کہ ''اَقْضَاهُمْ عَلِیٌّ ''تمام اصحاب سے بہتر و برتر قاضی (فیصلہ کرنیوالا) حضرت علی علیہ السلام ہیں اور حضرت عمر نے قدس (فلسطین) کی طرف کوچ کرتے وقت حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ نامزد کیا۔(۱)

معروف ریسرچر، لبنانی یونیورسٹی میں عربی ادب اور علوم اسلامیہ کے پروفیسر ڈاکٹر ظافر قاسمی نے اپنی کتاب میں ''نظام الحکم فی الشریعۃ والتاریخ الاسلامی' یعنی' اسلامی تاریخ اور شریعت میں نظام عدلیہ، کے موضوع کو زیر بحث لانے کے بعد درج ذیل سطور تحریر کیں:

''علی ابن ابی طالب علیہ السلام تمام اصحاب سے بہتر و برتر فیصلہ کرنے والے (قاضی) تھے، بظاہر آپؑ سے لوگ مشاورت کرتے تھے لیکن آپؑ نے کبھی کسی سے مشورہ طلب نہیں کیا۔ اس بارے میں کون جانتا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وہ بھی کسی سے کوئی سوال کریں اور مشورہ طلب کریں لیکن کتابوں میں کہیں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ کبھی کسی حادثہ و واقعہ میں حضرت علی علیہ السلام نے کسی صحابی سے کوئی مشورہ مانگا ہو'(۲)

درج بالا سطور کی درست تفسیر یہی ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی علمی استعداد و قابلیت اور ان کی اپنے ہم عصر افراد پر علمی برتری کی وجہ سے انہیں کبھی کسی مسئلہ یا مشکل میں کسی شخص کی طرف رجوع کرنیکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

شیخ محمد ابوزہرہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے علم کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے

۱۔ ابوالحسن ندوی، ''المرتضیٰ''، صفحہ 103، پہلا ایڈیشن 1989ء (دمشق: دارالقلم)

۲۔ ظافر قاسمی، نظام الحکم فی الشریعۃ والتاریخ الاسلامی، پہلا ایڈیشن 1978ء، صفحہ 329، (بیروت: دارالنفائس)

یوں بیان کیا ہے کہ:

''اسلام کے مختلف فرقوں کے علماء نے کسی امر پر یوں اتفاق اور اجماع نہیں کیا جس طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے علم وفضل پر اتفاق واجماع کیا ہے۔ اہلسنت کے وہ آئمہ جو آپؑ کے ہم عصر تھے انہوں نے آپ سے علم کا فیض حاصل کیا۔ آپؑ سے امام مالک اور ان کے طبقہ کے افراد جیسے سفیان بن عیینہ اور سفیان ثوری وغیرہ نے کسبِ علم کیا۔ ابوحنیفہ نے آپؑ کے ہم عصر ہونے کے باوجود آپ کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرتے ہوئے علم حاصل کیا اور ابوحنیفہ نے آپؑ کو سب لوگوں سے زیادہ اہل علم کہا ہے۔ تابعین کے ایک بہت بڑے گروہ نے آپ سے حدیث کی روایت کا اجازہ حاصل کیا۔ ان میں یحیٰی بن سعید انصاری، ایوب سختیانی، ابان بن تغلب اور ابوعمرو بن علاء وغیرہ اور فقہ وحدیث میں آئمہ تابعین شامل ہیں۔ جن لوگوں نے تابعین سے روایت کی یعنی تبع تابعین اور جو گروہ ان کے بعد آیا اور اجتہاد کرنے والے آئمہ جن میں سے بعض کی طرف ہم نے پہلے اشارہ کیا ہے ان کی تعداد تابعین کے گروہ سے بہت زیادہ ہے۔''(۱)

اسی طرح آئمہ اہل بیت علیہم السلام میں سے ہر امام اپنے زمانے میں علمی مرجعیت کا درجہ رکھتے تھے۔ امت مسلمہ کے درمیان جو مقام، قدر ومنزلت اور احترام اہل بیت علیہم السلام کو حاصل تھا کوئی عالم یا فقیہ اس کی برابری نہیں کرسکتا۔

اہل بیت علیہم السلام کا حسنِ اخلاق

انسانی نفوس اس شخص سے عشق کرتے ہیں جو پاکباز ہو اور اس کا سلوک پاکیزہ ہو۔ لوگ اس شخص سے محبت کرتے ہیں جس کی شخصیت اور زندگی بلند اخلاق کا پیکر ہو، لوگ اس کا احترام کرتے ہیں جو ان سے عزت اور احسان کے ساتھ باہمی معاملہ کرتا ہے۔

اہل بیت علیہم السلام کے ہم عصر افراد نے انکی سیرت میں فضل وکمال کے تمام عملی نمونے

۱۔ محمد ابوزھرہ، الامام الصادق، صفحہ 66 (بیروت: دار الندوۃ الجدیدۃ)

دیکھے جیسے نفس کی پاکیزگی، حسن سلوک، اچھا معاملہ، ضرورت مندوں کو وافر عطا کرنا، فقراء اور کمزور لوگوں کی مشکلات کو دور کرنا اور گناہ گاروں کو معاف کر دینا۔ یہ ہستیاں ان مکارم اخلاق کے ذریعے اپنے جد بزرگوار رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاق کے استمرار کی نمائندگی کر رہے تھے کہ جس رسول اکرمؐ کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں یوں توصیف فرمائی ہے:

''وَ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ'' ''بے شک آپ خلق عظیم کے مرتبے پر فائز ہیں''

اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور مصائب

اہل بیت علیہم السلام سے حسد کرنے والوں نے آپ پر مظالم کے پہاڑ توڑے اور اذیت سے دوچار کیا وہ یہ سب اسلئے کر رہے تھے کیونکہ انہیں اپنی حکومت اور تخت کے چھن جانے کا خطرہ تھا وہ حاسدین بخوبی جانتے تھے کہ اہل بیت علیہم السلام کا حلقہ وسیع ہے اور یہ لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں اس لئے ان ہستیوں کو مختلف طرح سے اذیت و تکلیف سے دوچار کیا گیا اور انہیں اپنے ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔ اہل بیت علیہم السلام کی مظلومیت اور مصائب کیلئے صرف ایک ہی مثال کافی ہے اور وہ ''واقعہ کربلا'' ہے۔ یہ ظلم و تکالیف جو اہل بیتؑ پر وارد ہوئیں اسکی وجہ سے امت مسلمہ کے افراد کے دلوں میں اہل بیت علیہم السلام کیلئے ہمدردی، عاطفت اور محبت کے جذبات بیدار ہوئے کیونکہ یہ انسان کی طبیعت اور مزاج میں داخل ہے کہ وہ ہمیشہ مظلوموں کیساتھ ہمدردی کرتا ہے۔

ہمدردی اور عاطفت کے یہ جذبات مستقل نظام اور پروگرام میں تبدیل ہوگئے اور انہوں نے ان دائمی شعائر کی صورت اختیار کر لی جو اہل بیت علیہم السلام کے پیروکار ہر جگہ اور ہر وقت انجام دیتے ہیں تا کہ اہل بیت علیہم السلام کی محبت اور ولایت ان لوگوں کے دلوں میں مزید راسخ ہو اور ان مقدس ہستیوں کی پاکیزہ سیرت اور بلند و بالا موقف کو پڑھ (یا سن) کر ان سے تجدید محبت و ولایت ہو۔

ہم اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں اپنے رسولؐ ان کی آل اطہارؑ اور اصحاب اخیارؓ کی محبت پر ثابت قدم فرمائے اور ہمیں ان لوگوں میں سے قرار دے جو رشد و ہدایت میں ان کی اقتداء کرتے ہیں اور ہمیں قیامت کے دن ان کے ساتھ محشور فرمائے۔ آمین

نص اور شوریٰ کے درمیان عقیدہ امامت

نص اور شوریٰ کے درمیان عقیدہ امامت

تمام سنی شیعہ مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا جو الہ واحد اور معبود یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کرنا اور وہ خاتم الانبیاء والمرسلین ہیں، قیامت کے دن اور قبروں سے دوبارہ زندہ اٹھائے جانے پر عقیدہ رکھنا۔ سب ایک ہی قرآن کو مانتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا اور وہ یہی قرآن مجید ہے جو آج مسلمانوں کے درمیان موجود ہے اس میں کسی قسم کی زیادتی یا کمی نہیں ہوئی ہے قرآن وسنت کو دین وشریعت کا مصدر ماننے پر بھی سب کا اتفاق ہے۔ اسی طرح تمام مسلمان نماز پنجگانہ کو ادا کرنے کیلئے ایک قبلہ (خانہ کعبہ) کی طرف منہ کرتے ہیں اور اس گھر کا حج کرتے ہیں، سب زکوٰۃ ادا کرتے اور ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھتے ہیں۔ پس تمام مسلمان درج بالا اصول دین اور ارکان دین میں متفق ہیں۔

سنی اور شیعہ مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا مرکزی نقطہ ''امامت وخلافت کے موضوع'' میں پنہاں ہے۔ اہلسنت کا نظریہ یہ ہے کہ یہ کام امت پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ شوریٰ اور انتخاب کے ذریعے امام اور خلیفہ کو چنتے ہیں جبکہ اہل تشیع کا اس حوالے سے یہ نظریہ ہے کہ امامت کو نص اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے تعین کے ذریعے ثابت کیا جاتا ہے۔

امامت کے متعلق کیوں گفتگو کی جاتی ہے؟

۱۔ امامت کے متعلق گفتگو کا تاریخ سے اور جو عملی طور پر مسلمانوں کی زندگی میں ان کے ساتھ ہوا ہے اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کو دیکھا جائے تو اس کے مطابق پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر بن ابی قحافہ، دوسرے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب، تیسرے خلیفہ حضرت عثمان بن عفان اور ان کے بعد حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام پھر چند ماہ کیلئے آپؑ کے فرزند حضرت حسن مجتبیٰ علیہ السلام نے تخت خلافت سنبھالا پھر حکومت کی باگ ڈور معاویہ بن ابی سفیان نے سنبھالی اور اس کے بعد خاندان بنوامیہ کے افراد اس حکومت کے منصب کو سنبھالتے رہے یہاں تک کہ ان کی حکومت ختم ہونے کے بعد بنو عباس کی حکومت قائم ہوئی یوں اسلامی تاریخ کے مطابق حکومت کا سلسلہ جاری رہا جیسا کہ معروف ہے۔

۲۔ امامت کے متعلق گفتگو کرتے وقت اختلافات کو ہوا دینا اور نفرتوں اور کدورتوں کا اظہار کرنا بالکل مناسب نہیں۔ اس موضوع کو اس طرح زیر بحث نہیں لانا چاہیے کہ مسلمان ایک دوسرے کے خلاف جذبات کو ابھار کر انہیں موجودہ حالات وواقعات سے بے خبر کر دیا جائے جبکہ آج کے دور میں مسلمانوں کو اتحاد واتفاق کی زیادہ ضرورت ہے۔

۳۔ یہ بہت ضروری ہے کہ مسلمان ایک دوسرے سے آگاہی حاصل کریں اور ہر فریق دوسرے کے سامنے اپنا نکتہ نظر واضح طور پر بیان کرے اور یہ پرسکون ماحول میں موضوعی اعتبار سے ہونا چاہیے، اس کا ہدف ومقصد دوسرے کو اپنا ہم مذہب وہم مسلک بنانا نہ ہو تاکہ سنی مسلمان شیعی مسلمان کے نکتہ نظر سے مطمئن ہو سکے اور شیعی مسلمان سنی مسلمان کے نکتہ نظر سے آگاہی حاصل کر سکے، کیونکہ معرفت وآگاہی سے ایک دوسرے کو سمجھنے کا ماحول پیدا ہوتا ہے اور یوں ان لوگوں کے باطل ارادوں کے سامنے بند باندھ دیا جاتا

ہے جو ایک دوسرے کے فریق کے سامنے دوسرے کی تصویر کو غلط انداز میں بیان کر کے اپنے مذموم مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ آج کے زمانے میں ترقی یافتہ ممالک میں موضوعاتی تعارف کے طریقہ کو اپنایا جاتا ہے یہاں تک کہ جو گروہ ان کے ممالک میں آتے ہیں انہیں معاشرے میں ضم کرنے، ان افراد کو قبول کرنے کیلئے زمین ہموار کرنے اور ان کا عام زندگی میں شریک ہونے اور دوسروں کے خلاف کھڑے ہونے والے انتہا پسند عناصر کے آگے بند باندھنے کیلئے اس طریقہ کار کو اپنایا جاتا ہے تاکہ باہمی موضوعی تعارف کے ذریعے وہ ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔

کچھ عرصہ پہلے غاصب اسرائیلی حکومت کا اسرائیلی کنیسہ (یہودی عبادت گاہ) سے جھگڑا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسرائیل کا وزیر تعلیم و تربیت ایک ایسی قرارداد پاس کروانا چاہتا تھا جس کے مطابق اسرائیل کے سکولوں میں فلسطین کی ادبی شخصیات کی ادبی نصوص و عبارات کو پڑھایا جانا تھا تاکہ اسرائیلی قوم اپنے اردگرد بسنے والی فلسطینی قوم سے شناسائی حاصل کر سکے۔

ہمارا اسلامی دین جو کہ دین حنیف ہے وہ ہماری یہ تربیت کرتا ہے کہ ہم دوسروں کی رائے بغور سنیں، جیسا کہ ارشاد پروردگار ہے:

''اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ''(۱)

''میرے ان بندوں کو خوش خبری سنا دو) جو بات کو غور سے سنتے ہیں اور پھر ان میں سے سب سے اچھی بات کی پیروی کرتے ہیں۔''

اسلام ہمیں یہ حکم دیتا ہے کہ ہم دوسروں کے متعلق اپنی معلومات کی تحقیق کریں کہ یہ معلومات درست ہیں یا غلط، اور ہم جہالت کی وجہ سے دوسروں کو متہم نہ کریں بلکہ ہمیں حقیقت سے آگاہی حاصل کرنی چاہیے جیسا کہ قرآن مجید میں پروردگار کا ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ سورہ الزمر آیت نمبر 18

''فَتَبَيَّنُوْا اَنْ تُصِيْبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِيْنَ''(۱)

''پس تم اچھی طرح چھان بین کرلیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم کسی قوم کو لاعلمی کی وجہ سے نقصان پہنچادو پھر تمہیں اپنے کئے پر پشیمان ہونا پڑے''

اسی لئے ہم امامت کو متعلق نص سے ثابت ہونے کے متعلق گفتگو کریں گے جو کہ شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے اور اسی طرح ہم امامت کے متعلق شوریٰ سے ثابت ہونے کے متعلق گفتگو کرتے ہیں جو کہ اہلسنت کا عقیدہ ہے کہ خلافت شوریٰ سے ثابت ہوتی ہے۔

امامت اور شمولیت کا اسلام

اسلام ایک ایسا جامع نظام و قانون ہے جو انسان کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے تو کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا جامع دین امت کیلئے قیادت اور امامت کے موضوع کو بالکل بیان نہ کرے؟

امامت کا موضوع انتہائی اہم اور حساس موضوع ہے اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع میں بھی اسلام نے اپنی رائے اور منہج کو واضح طور پر بیان کیا ہو۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کوئی بھی اجتماعی نظام ہو وہ سب سے پہلے قیادت اور حکمرانی کے مسئلہ کو حدود و قیود کے ساتھ بیان کرتا ہے ۔ یہاں تک کہ اگر کسی مخصوص ادارہ یا فلاحی تنظیم کا سربراہ بنانا ہو تو اس سربراہ کی شرائط سب سے پہلے طے کی جاتی ہیں، تو اس صورت میں یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام نے امامت کے موضوع کو مہمل اور عبث (فضول، بیکار) قرار دیا ہو؟ اور امامت کے متعلق اپنا نکتہ نظر بیان نہ کیا ہو؟ اور اسلامی معاشرہ میں امامت کیلئے کوئی طریقہ موجود نہ ہو؟ حالانکہ ہم بھی جانتے ہیں کہ یہ نیا معاشرہ اسلام کی تعلیمات اور رہنمائی کے مطابق تشکیل پاتا ہے۔

۱۔ سورہ الحجرات، آیت نمبر 6

جب فقہاء باجماعت نماز کے احکام بیان کرتے ہیں تو اس میں ''نماز میں امامت'' کے موضوع کو بھی ذکر کیا جاتا ہے اور وہ اس حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مروی احادیث کی روشنی میں بیان کرتے ہیں کہ کس شخص کو باجماعت نماز کی امامت کروانے کا زیادہ حق اور اَوْلَـوِیْـتَ حاصل ہے پس شریعت اسلامیہ میں کچھ لوگوں کا باجماعت نماز کی امامت کروانا صحیح ہے اور کچھ لوگوں کو باجماعت نماز کی امامت کروانے کا زیادہ حق اور اولویت حاصل ہے اور کچھ لوگوں کیلئے باجماعت نماز کی امامت کروانا مکروہ ہے۔۔۔اس مسئلہ کی تفصیل اور مختلف مذاہب اور فقہاء کے درمیان اس حوالے سے جو اختلاف موجود ہے وہ سب فقہی کتب میں مذکور ہے۔پس اگر باجماعت نماز میں امامت کے مسائل کو شریعت اسلامیہ میں بیان کیا گیا ہے تو یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسلام امت میں امامت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت جیسے اہم مسئلہ سے لاعلم ہے اور اسے بیان نہیں کیا گیا؟ اور یہ کہ اسلام نے امام کیلئے قواعد وضوابط کا تعین نہیں کیا ہے؟

نبیؐ اور مستقبل میں دعوت اسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات اور دنیا سے کوچ کرنا کوئی اچانک اور غیر متوقع امر نہیں تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جانتے تھے کہ اس حوالے سے ان کو بھی باقی لوگوں کی طرح دنیا سے کوچ کرنا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

''اِنَّکَ مَیِّتٌ وَ اِنَّھُمْ مَیِّتُوْنَ''(۱)

''بے شک آپ کو بھی موت کا سامنا کرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی موت کا سامنا کرنا ہے''

بلکہ آپؐ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی موت کے وقت کے قریب ہونے کی طرف بار بار اشارہ فرماتے رہے، تو کیا آپؐ کو مستقبل میں دعوت اسلام اور اپنی وفات کے بعد اپنی

ا۔ سورۃ الزمر، آیت نمبر 30

امت کی فکر لاحق تھی؟ یا انہیں اپنی امت کی کچھ پرواہ نہ تھی اور نہ ہی انہوں نے اس حوالے سے کوئی اہتمام فرمایا؟ مستقبل میں دعوت اسلام کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بالکل اہتمام نہ کرنا یہ آپؐ سے ایک بعید امر ہے بلکہ آپؐ تو دین اسلام کو محفوظ رکھنے اور امت کی مصلحت کے انتہائی خواہش مند تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے باعث قیادت کے منصب کا خالی ہوجانا اور پھر یہ سوچنا کہ ایسے حالات میں دین اور امت کیلئے کوئی خطرے کی بات نہیں اور ان کے مستقبل کے حوالے سے مطمئن اور پراعتماد ہونا انسانی حالات اور طبیعت کے برعکس امر ہے۔ خاص طور پر اس نئے معاشرے میں جن کی ماضی کی تاریخ قبائلی تعصّبات، نسلی جھگڑوں اور اپنے مفادات کی بناء پر اختلاف سے بھری پڑی ہو اور اس کے ساتھ اسلام کو بیرونی دشمنوں سے بھی خطرہ ہو اور اسلامی معاشرے میں منافقین بھی سرایت کر چکے ہوں تو ایسے حالات میں قیادت و رہبری کا منصب خالی چھوڑ دینا ناقابل قبول بات ہے۔

تاریخ میں ایسے بہت سے شواہد موجود ہیں کہ جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بعض مشکلات، فتنوں اور حوادث کا تذکرہ کیا جو ان کی امت کو مستقبل میں درپیش ہوں گے اور آپؐ نے اپنی امت کو ان فتنوں سے ڈرایا اور خبردار کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ کو اپنی امت کے مستقبل کی فکر تھی اور آپؐ اس سے بالکل غافل نہ تھے اور آپؐ کے بعد امت مسلمہ کو جن خطرات اور چیلنجز کا سامنا کرنا تھا آپؐ ان سے بخوبی واقف تھے، ان حالات اور فتنوں میں امت مختلف احتمالات اور توقعات سے وابستہ ہوگی یہ کیسے ممکن نہیں ہوسکتا جبکہ قرآن کریم نے غزوہ احد سے متعلقہ واقعات کو واضح طور پر بیان کیا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی کیا کیفیت تھی اور ان کے حوصلے کس قدر پست ہو چکے تھے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کی افواہ پھیلائی گئی۔ اس بارے میں پروردگار کا ارشاد ہے:

''وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلُ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِكُمْ''(۱)

''حضرت محمدؐ صرف (اللہ کے) رسول ہیں اوران سے سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں کیا یہ وفات پاگئے یا قتل کردیئے گئے تو تم الٹے پاؤں واپس پلٹ جاؤ گے (یعنی دوبارہ کافر ہوجاؤ گے؟)''

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دین اسلام کی بقاء اور امت اسلامیہ کے مستقبل کے حوالے سے جس قدر فکرمند تھے وہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ آپؐ قیادت کے اس خالی ہوجانے والے منصب کا علاج بتا کر جائیں جس کا آپؐ کی وفات کے باعث سامنا کرنا پڑے گا۔

شوریٰ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امامت کے موضوع کے بارے میں دو میں سے ایک احتمال ہوگا:

۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ امر مسلمانوں پر چھوڑ دیا کہ وہ آپس میں مشاورت کر کے کسی کو امت کے منصب پر فائز کرلیں۔ اسلام میں صحابہ کی ایک نسل کی رسول پاکؐ نے تربیت فرمائی اور انہیں وحی کی توجیہات وتعلیمات سے سیراب فرمایا پس شوریٰ کے نظریہ کی بنیاد پر اصحاب کے کاندھوں پر یہ مسئولیت ڈال دی گئی کہ وہ امام اور خلیفہ کا انتخاب کریں۔

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک معین شخص کے بارے میں نص بیان فرمائی ہو کہ وہ مخصوص شخص آپؐ کے بعد امام اور خلیفہ ہوگا۔

۱۔ سورہ آل عمران۔ آیت نمبر 144

لیکن یہاں یہ بات قابل ملاحظہ ہے کہ اگر شوریٰ کو بطور نظام اور منہج کے اپنانا ہوتا تو پھر امت مسلمہ کے درمیان اس نظام کی تاکید اور اس کے اصول وضوابط بیان کرنے کی ضرورت تھی کہ شوریٰ میں کون لوگ ہوں گے؟ تمام مسلمان شوریٰ کے افراد ہیں؟ یا صرف مدینہ منورہ کے لوگ؟ یا شوریٰ کے افراد اہل الحل والعقد ہیں؟ اور اہل الحل والعقد سے مراد کون لوگ ہیں؟ شوریٰ میں خلیفہ وامام کا انتخاب اجماع سے ہوگا یا اکثریت سے ہوگا؟ یہ تمام امور رسول اللہؐ کی احادیث یا ان کی سیرت کی روشنی میں بالکل واضح نہیں ہیں۔

دوسرے لحاظ سے اس بات کو یوں بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب اور امت کو قیادت وامامت کے مسائل میں نظام شوریٰ کیلئے تیار نہیں کیا اور آپؐ نے ان کی اس حوالے سے مشق اور ٹریننگ نہیں کی۔ آپؐ جب مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم کو نماز کی امامت اور دیگر امور کیلئے مدینہ میں اپنا خلیفہ نامزد کر کے جاتے اور آپؐ نے کبھی یہ کام لوگوں پر نہیں چھوڑا کہ وہ خود جسے جی چاہے اپنا امام اور امیر بنالیں۔ اسی طرح آپؐ جب بھی کوئی سریہ یا لشکر کسی معرکہ اور مشن کیلئے روانہ فرماتے تو خود ان کا سردار متعین فرماتے۔

بعض اوقات آپؐ کئی سردار یکے بعد دیگرے متعین فرماتے جیسا کہ غزوہ موتہ میں آپؐ نے تین افراد کو باری باری سردار بنانے کا حکم صادر فرمایا کہ حضرت جعفر طیارؓ بن حضرت ابوطالبؑ، ان کی شہادت کی صورت میں حضرت زید بن حارث اور پھر حضرت عبداللہ بن رواحہ لشکر کے سردار ہوں گے اس لئے امامت وخلافت کے بارے میں شوریٰ کا نظریہ اصحاب کے ذہنوں میں واضح اور راسخ نہیں تھا۔ جو شخص سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ اول حضرت ابوبکر کی بیعت کے متعلق واقعات کا مطالعہ کرتا ہے اور جو کچھ اس بیعت کے حوالے سے خلیفہ ثانی نے بیان کیا ہے اس سے یہ واضح اور آشکار ہوتا ہے کہ اس وقت اصحاب کی آراء اور موقف بالکل بھی شوریٰ

کے نظریہ کے تحت نہیں تھا۔

اسی لئے سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ بنانے کیلئے مختلف احتمالات کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اس بارے میں خلیفہ ثانی حضرت عمر کا قول ہے۔ ابوبکر کی بیعت کی ایک ہڑ بڑاہٹ والی غلطی ہے جس کے شر سے خدا نے امت کو محفوظ رکھا۔

صحیح بخاری میں درج ذیل عبارت مذکور ہے:

''اِنَّمَا کَانَتْ بَیْعَةُ اَبِیْ بَکْرٍ فَلْتَةً وَتَمَّتْ، اَلاَ وَ اِنَّهَا قَدْ کَانَتْ کَذٰلِکَ، وَلٰکِنَّ اللّٰهَ وَقٰی شَرَّهَا''(۱)

''بے شک ابوبکر کی بیعت ایک بڑ بڑاہٹ والی غلطی تھی مگر اس کے باوجود یہ پایہ تکمیل تک پہنچی اور اللہ نے اس کے شر سے امت کو محفوظ رکھا۔''

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام اور آپ کے ہمراہ کئی اصحاب کا سقیفہ میں جو کچھ ہوا اس کے نتائج کو قبول کرنے سے انکار کرنا پھر حضرت ابوبکر کا استخلاف کے طریقہ کے مطابق خود ہی خلافت کو اپنے بعد حضرت عمر بن خطاب کے حوالے کرنا پھر حضرت عمر کا اپنی وفات کے وقت شوریٰ (کمیٹی) بنا دینا جس میں اصحاب میں سے چھ افراد کو رکھا گیا تا کہ یہ چھ افراد آپس میں کسی پر اتفاق کر کے اس ایک فرد کو امت کیلئے پر خلیفہ منتخب کر لیں، پھر حضرت عثمان کے قتل کے بعد امت مسلمہ کا حضرت علی علیہ السلام کو خلافت کا منصب سنبھالنے پر اصرار کرنا، پھر اسی طرح آپ کے بعد امویوں اور عباسیوں نے طاقت اور غلبہ کے بل بوتے پر خلافت کا منصب حاصل کیا۔

پس امامت وخلافت کے موضوع کے معالجہ کیلئے مختلف اور متعدد طریقوں کو اپنانا اس

۱۔ صحیح البخاری، کتاب المحاربین اہل الکفر والردۃ، باب رجم الحبلیٰ من الزنا اذا احصنت، جلد 4 صفحہ 288، حدیث 2830

بات پر دلالت کرتا ہے کہ شوریٰ کے اصول وضوابط واضح نہیں ہیں کہ شوریٰ کو رسول پاکؐ کی طرف سے یا مسلمانوں کی ذہنیت کے مطابق خلیفہ منتخب کرنے کیلئے ایک نظام کے طور پر قرار دیا گیا ہو۔

نص اور تعیین

شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ امت اسلامیہ کو اختلاف اور جھگڑے سے محفوظ رکھنے کیلئے امامت کا انتخاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے نص کے ذریعے ہوتا ہے کیونکہ اللہ اور اسکے رسولؐ کا کسی کو امامت کیلئے چننا اور منتخب کرنا سب سے بہتر اور افضل طریقہ ہے۔ ایسی احادیث (نصوص) وارد ہیں جن کا درست ہونا شیعہ اور غیر شیعہ کے نزدیک ثابت ہے اور ان احادیث سے اہل تشیع اس معنی کو سمجھتے ہیں کہ یہ حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کی امامت پر دلالت کرتی ہیں کہ انہیں ان نصوص کے ذریعے اس منصب امامت پر متعین کیا گیا ہے۔

ان نصوص میں سرفہرست ''حدیث غدیر خم'' ہے جبکہ اس حدیث کو اہل سنت اور اہل تشیع کی معتبر اور قابل اعتماد کتب اور مصادر الحدیث میں بہت زیادہ صحیح طریقوں سے نقل کیا گیا ہے۔

ہم اس حدیث کے متعلق موجودہ زمانے کے سلفی محدث ناصر الدین البانی نے جو کچھ بیان کیا ہے اسے یہاں ذکر کرتے ہیں انہوں نے اپنی کتاب ''سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ'' کی جلد نمبر 4، حدیث نمبر 1750 کے تحت یہ تحریر کیا ہے کہ یہ حدیث دس اصحاب سے تئیس طریقوں سے روایت کی گئی ہے اور انہوں نے ان تئیس طریقوں کی تعداد کو چودہ صفحات صفحہ 330 تا 344 پر مفصل بیان کیا ہے۔

ناصر الدین البانی نے حدیث غدیر کو روایت کرنے والے جن دس اصحاب کا ذکر کیا ہے وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ زید بن ارقم، ان سے حدیث غدیر پانچ طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔

۲۔ سعد بن ابی وقاص، ان سے حدیث غدیر تین طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔
۳۔ بریدہ بن حصیب، ان سے حدیث غدیر تین طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔
۴۔ علی ابن ابی طالبؑ، ان سے حدیث غدیر نو طریقوں سے نقل کی گئی ہے۔
۵۔ ابوایوب انصاری، ان سے حدیث غدیر ایک طریقہ سے نقل کی گئی ہے۔
۶۔ براء بن عاذب، ان سے حدیث غدیر ایک طریقہ سے نقل کی گئی ہے۔
۷۔ عبداللہ ابن عباس، ان سے حدیث غدیر ایک طریقہ سے نقل کی گئی ہے۔
۸،۹،۱۰۔ انس بن مالک، ابوسعید الخدری اور ابوہریرہ سے حدیث غدیر ایک طریقہ سے نقل کی گئی ہے۔

ناصر الدین البانی نے زید بن ارقم کی حدیث کی پہلے طریق کی رو سے حدیث غدیر کی درج ذیل عبارت نقل کی ہے:

''عَنْ اَبِی الطُّفَیْلِ عَنْهُ قَالَ: لَمَّا دَفَعَ النَّبِیُّ مِنْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ، وَ نَزَلَ غَدِیْرُ (خُمٍ)، اَمَرَ بِدَوْحَاتٍ فَقُمِنَ، ثُمَّ قَالَ: کَاَنِّیْ دُعِیْتُ فَاَجَبْتُ، وَاِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ اَحَدُهُمَا اَکْبَرُ مِنَ الْآخَرِ، کِتَابَ اللّٰهِ وَ عِتْرَتِیْ اَهْلَ بَیْتِیْ، فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَخْلُفُوْنِیْ فِیْهِمَا فَاِنَّهُمَا لَنْ یَفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ، ثُمَّ قَالَ: اِنَّ اللّٰهَ مَوْلَایَ وَ اَنَا وَلِیُّ کُلِّ مُؤْمِنٍ، ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِ عَلِیٍّ فَقَالَ: مَنْ کُنْتُ مَوْلَاهُ فَهٰذَا وَلِیُّهُ، اَللّٰهُمَّ وَالِ مَنْ وَالَاهُ وَ عَادِ مَنْ عَادَاهُ''

''ابوطفیل نے زید بن ارقم سے نقل کیا ہے، زید بن ارقم بیان کرتا ہے جب نبی اکرمؐ حجۃ الوداع سے واپس تشریف لا رہے تھے تو غدیر خم کے مقام پر قیام فرمایا، آپؐ نے سائبان لگانے کا حکم دیا تو وہ لگا دیئے گئے، پھر فرمایا: مجھے لگتا ہے کہ عنقریب مجھے (وصال کا) بلاوا آنے کو ہے جسے میں قبول کرلوں گا۔ بتحقیق میں تمہارے درمیان دو اہم چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں جو ایک دوسرے

سے بڑھ کر اہمیت کی حامل ہیں، ایک اللہ کی کتاب (قرآن مجید) اور دوسری میری عترت واہل بیتؑ ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ تم میرے بعد ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو اور وہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گی یہاں تک کہ حوض کوثر پر میرے سامنے آجائیں گی۔ پھر فرمایا: بے شک اللہ میرا مولا ہے اور میں ہر مومن کا مولا ہوں اس کے بعد حضرت علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا: جس کا میں مولا ہوں اس کا یہ ولی ہے، اے اللہ! جو اسے (علیؑ کو) دوست رکھے تو اسے دوست رکھ اور جو اس سے عداوت رکھے تو ان سے عدات رکھ۔''

اسکے بعد ناصر الدین البانی اس بات کا اضافہ کرتا ہے کہ حدیث غدیر کو اور بھی کافی طرق سے نقل کیا گیا ہے اور ان طرق کو علماء ومحدثین کے ایک بڑے گروہ نے جمع کیا ہے۔ ان میں سے ھیثمی بھی ہیں جنہوں نے اپنی کتاب ''مجمع الزوائد'' (جلد 9، صفحہ 103 تا 108) میں ان تمام طرق کو بیان کیا ہے۔ ان تمام طرق میں سے جو میرے لئے آسان تھا وہ میں نے تخریج کی اور ان طرق کو بیان کیا جبکہ جو بھی ان کا مطالعہ کر کے غور وفکر کرے اسے انکی صحت کا یقین حاصل ہوتا ہے۔

اس حدیث غدیر کی اسانید کی تحقیق کرنے کے بعد اس کے درست اور صحیح ہونے کا یقین ہو جاتا ہے اگر چہ کہ اس کی اسناد کافی زیادہ ہیں۔ ابن عقدہ نے کتاب مفرد میں اسکی اسناد کو ذکر کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے بیان کیا کہ اس کی اسناد میں سے بعض صحاح اور بعض حسان ہیں۔ (۱)

جن اہلسنت علماء نے حدیث غدیر کو بیان کرنے کے ساتھ اسے صحیح قرار دیا ہے اور اس کے صحیح ہونے کا دفاع کیا ہے ان میں سے ایک محدث احمد بن حجر الھیثمی المکی (متوفی 974ھ) ہیں وہ اپنی کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' میں بیان کرتے ہیں:

''رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی پر جحفہ کے مقام پر غدیر خم کے دن اصحاب کو جمع کیا اور ان سے تین دفعہ پوچھا، اَلَسْتُ اَوْلٰی بِکُمْ مِنْ

۱۔ سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ جلد 4 صفحہ 343

اَنۡفُسِکُمۡ ؟ یعنی کیا میں تم پر تمہاری جانوں سے زیادہ حق نہیں رکھتا؟ تو سب نے اعتراف کیا کہ آپؐ ہم پر ہماری جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں، پھر آپؐ نے حضرت علی علیہ السلام کا ہاتھ بلند کر کے فرمایا:

" مَنۡ کُنۡتُ مَوۡلَاہُ فَعَلِیٌّ مَوۡلَاہُ ، اللّٰھُمَّ وَ الِ مَنۡ وَ الَاہُ وَ عَادِ مَنۡ عَادَاہُ وَ اَحِبَّ مَنۡ اَحَبَّہُ وَ اَبۡغِضۡ مَنۡ اَبۡغَضَہُ وَ انۡصُرۡ مَنۡ نَصَرَہُ ، وَ اخۡذُلۡ مَنۡ خَذَلَہُ وَ اَدِرِ الۡحَقَّ مَعَہُ حَیۡثُ دَارَ "

"جس کا میں مولا ہوں" اسکے علیؑ مولا ہیں، اے اللہ! جو اس (علیؑ) سے دوستی رکھے تو اسے دوست رکھ، جو اس سے عداوت رکھے تو تو بھی اس سے عداوت رکھ، جو اس سے محبت رکھے تو اس سے محبت رکھ اور جو اس سے بغض رکھے تو بھی اس سے بغض رکھ، جو اس کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد کر اور جو اس کی مدد نہ کرے تو بھی اس کی مدد نہ کر اور حق کو ادھر موڑ دے جس طرف علیؑ مڑیں"

ابن حجر نے اس حدیث کو ذکر کرنے کے بعد تاکید کرتے ہوئے کہا ہے: "یہ حدیث صحیح ہے اور اس میں شک اور جھگڑا کرنے کی گنجائش نہیں ہے اس حدیث کو ایک جماعت جیسے ترمذی، نسائی اور احمد نے تخریج کیا ہے اور سولہ صحابیوں نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

احمد کی روایت کے مطابق نبی کریمؐ سے تیس (۳۰) اصحاب نے اس حدیث کو سنا تھا اور جب حضرت علی علیہ السلام کے دورِ خلافت میں نزاع واقع ہوا تو انہوں نے گواہی دی کہ یہ حدیث حضرت علی علیہ السلام کی شان میں نازل ہوئی ہے۔

جیسا کہ یہ پہلے گزر چکا ہے اور آئندہ بھی بیان کریں گے اس کی زیادہ تر اسناد صحاح اور حسان ہیں، جس نے اس حدیث کے صحیح ہونے پر اعتراض کیا ہے اور جس نے اسے رد کیا

ہے اس کی اس بات پر توجہ دینے کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہے۔(۱)

حدیث غدیر ان بہت سی احادیث میں سے صرف ایک حدیث ہے جو اہل تشیع کے نکتہ نظر کے مطابق حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی امامت پر نص ہے۔

اگر دیگر مسالک کے افراد ان نصوص (احادیث) کے معنی کو سمجھنے میں شیعوں سے اختلاف رکھتے ہیں تو یہ ہرگز ان کی امامت کیلئے مانع اور رکاوٹ نہیں ہے بلکہ ہر شخص کو یہ موقع دینا ضروری ہے کہ وہ ان احادیث میں علمی طور پر اجتہاد کر کے اپنا نکتہ نظر باہمی احترام سے بیان کرے اور اس علمی بحث و مباحثہ میں باہمی بھائی چارے اور اسلامی وحدت کی فضاء بھی قائم رہنی چاہیے۔

۱۔ الصواعق المحرقۃ۔صفحہ 40

اہل بیت علیہم السلام کا مدمقابل حکومتوں سے برتاؤ

اہل بیت علیہم السلام کا مدمقابل حکومتوں سے برتاؤ

اہل بیت علیہم السلام کا فکری وفقہی مدرسہ اسلام کی مکمل تصویر اور اسلام کی عملی طور پر تطبیق کیلئے مکمل پروگرام تشکیل دیتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ اہلبیتؑ دین کی صحیح سوجھ بوجھ اور فہم کی نشر واشاعت کا بہت زیادہ اہتمام کرتے تھے تاکہ مسلمانوں کی زندگی میں اس کو نافذ و راسخ کیا جائے۔

چونکہ احادیث نبویؐ میں اہل بیت علیہم السلام کی طرف رجوع کرنے کی تلقین کی گئی جیسا کہ حدیث ثقلین، حدیث کشتی نوح اور حدیث غدیر وغیرہ اور اہل بیت علیہم السلام کو شریعت خدا سے سب سے زیادہ آگاہی ومعرفت حاصل تھی اس لئے آئمہ اہل بیت علیہم السلام بھی خود کو امت کی قیادت اور امامت کیلئے سب سے زیادہ حقدار سمجھتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے حکومت پر غلبہ پانے اور اکثریت پر تسلط قائم کرنے کیلئے کبھی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کسی کو لڑائی جھگڑے پر اکسایا ہے۔

حضرت امام علی علیہ السلام اور خلافت

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت ابوبکر کی بیعت کی گئی تو وہاں کئی ایسے افراد تھے جنہوں نے اس خلافت کا راستہ روکنے کیلئے حضرت علیؑ کو اکسایا جیسا کہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ذکر کیا ہے:

''تمام انصاریوں میں سے بعض نے کہا: ہم صرف حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کریں

گے اور زبیر نے کہا: میں تلوار کو نیام میں نہیں رکھوں گا یہاں تک کہ حضرت علی علیہ السلام کی بیعت کر لی جائے۔ ابوسفیان نے حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں آ کر کہا: میں ایک ایسا فتنہ دیکھ رہا ہوں جسے صرف خون (قتل و غارت گری) سے بجھایا جا سکتا ہے، پھر اس نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا: آپؑ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں تا کہ میں آپؑ کی بیعت کروں، خدا کی قسم اگر آپ حکم دیں تو میں اس شخص (ابوبکر) کے خلاف مدینہ کی گلیوں کو پیادہ اور گھڑ سواروں سے بھر دوں۔ اس پر حضرت علیؑ نے اسے سرزنش کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم! تم اس کام سے صرف فتنہ و فساد پیدا کرنا چاہتے ہو، خدا کی قسم! تم نے ہمیشہ شر انگیزی کرتے ہوئے اسلام کے خلاف بغاوت و سرکشی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ہمیں تمہاری نصیحت کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔''(۱)

اسی طرح کی عبارت تاریخ طبری میں بھی مذکور ہے۔(۲)

ابن قتیبہ نے اپنی کتاب ''الامامت والسیاست'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا:

''آپؑ اپنا ہاتھ آگے بڑھائیں تا کہ میں آپؑ کی بیعت کروں، اس پر حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا، پھر لوگ یہ کہیں گے: رسول اللہؐ کے چچا نے رسول اللہؐ کے چچا زاد بھائی کی بیعت کی ہے اور آپ کے گھر اور خاندان والوں نے آپ کی بیعت کی ہے۔''(۳)

حضرت علی علیہ السلام نے خطرناک حالات دیکھتے ہوئے اور امت اسلامیہ کی وحدت کی

۱۔ عزالدین ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی، الکامل فی التاریخ جلد 2، صفحہ 11-10، 1989ء (بیروت: موسسہ التاریخ الاسلامی)

۲۔ محمد بن جریر طبری، تاریخ الطبری، جلد 2، پانچواں ایڈیشن 1409ھ، صفحہ 449 (بیروت: موسسہ الاعلمی)

۳۔ عبداللہ بن مسلم ابن قتیبہ دینوری، الامامت والسیاست جلد 1 پہلا ایڈیشن، صفحہ 12، 387ھ (قاہرہ: موسسہ الحلبی، تحقیق: طہ محمد العزینی)

خاطر بیعت کے ان تمام مطالبات کو رد کر دیا۔ حضرت علی علیہ السلام کو دوسری مرتبہ خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب کے قتل کے بعد خلافت کی پیشکش کی گئی۔ آپؑ کو شوریٰ کے ان چھ افراد میں سے ایک قرار دیا گیا جو حضرت عمر نے بنائی تا کہ اُن میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کا خلیفہ چن لیا جائے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے مسلمانوں کے سامنے مسجد نبویؐ میں حضرت علی علیہ السلام کے سامنے یہ کہہ کر خلافت کا منصب پیش کیا۔ ''کیا آپؑ اس بات پر مجھ سے بیعت لیں گے کہ کتاب اللہ (قرآن مجید) اس کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت اور ابوبکر و عمر کے طریقہ پر کاربند رہیں گے؟ تو امام علی علیہ السلام نے فرمایا: نہیں (میں ان دونوں کے طریقہ پر کاربند نہیں رہوں گا) بلکہ میں اپنی کوشش اور طاقت کے مطابق (قرآن وسنت) کی رو سے کام کروں گا۔(۱)

آپؑ نے اس وقت اس وجہ سے حکومت اور خلافت سے انکار کر دیا کہ جس شرط سے آپ مطمئن نہیں ہیں اس پر کاربند رہنے کا عہد نہیں کر سکتے۔ آپؑ حکومت کے حصول سے زیادہ اپنے اصولوں کی پاسداری کرنے والے تھے۔

مولف کہتے ہیں کہ میں نے شوریٰ کے اس تاریخی واقعہ کے متعلق ڈاکٹر اسماعیل الشطی (۲) کا خوبصورت تجزیہ پڑھا ہے اس نے اس میں بیان کیا ہے:

''مسلمانوں کی پہلی نسل ملک کو چلانے کیلئے اپنے سیاسی اور تنظیمی تجربہ کو شریعت کا جزو قرار دینا چاہتی تھی اگر حضرت امام علی ابن ابیطالب (کرم اللہ وجہہ) اس قسم کی کوشش کو روکنے کیلئے اپنا کردار ادا نہ کرتے اور آپؑ نے اس سوچ کے آگے بند باندھنے کیلئے خلافت کے منصب کو قربان کر دیا کہ جب آپؑ کو سب سے پہلی دفعہ خلافت کی (شوریٰ میں) پیش کش ہوئی تو آپؑ نے کتاب اللہ اور نبیؐ کی سنت کے ساتھ شیخین کے تجربہ اور طریقہ پر چلنے کا انکار کر کے ان

۱۔ ابوالفداء حافظ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ جلد 7، پہلا ایڈیشن 2001، صفحہ 142 (بیروت: دارالکتب العلمیہ)

۲۔ یہ کویت کی ایک اسلامی وسیاسی شخصیت ہیں۔

لوگوں کی کوشش کو ناکام بنا دیا۔ اگر آپؑ شیخین کے طریقہ پر چلنے کی حامی بھر لیتے تو یہ بشری اجتہاد شمار نہیں ہونا تھا بلکہ بعد میں اس سے مزید آفاق وسیع ہونے تھے لیکن امام علیؑ نے خلافت کی قربانی دے کر دین کی حدوں سے تجاوز کر کے ان میدانوں میں پھلانگنے والوں کے آگے راستہ بند کر دیا۔''(۱)

مئورخین نے ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان کے قتل کے بعد حضرت علیؑ نے خلافت کے منصب کو اپنانے سے انکار کر دیا اور آپؑ نے حکومت وخلافت سے کنارہ کشی اختیار کرنے کو ترجیح دی۔ اگر عوام کا اصرار نہ ہوتا تو آپ ہرگز اس وقت بھی خلافت کے منصب کو قبول نہ کرتے جیسا کہ ابن کثیر نے بیان کیا ہے:

''حضرت علی علیہ السلام نے لوگوں کی طرف سے حکومت قبول کرنے کے مطالبہ کو رد کر دیا یہاں تک کہ لوگ بار بار آپؑ سے حکومت قبول کرنے کی درخواست کرتے رہے اور آپؑ ان لوگوں کے پاس سے نکل کر بنو عمرو بن مبدول کے پاس آ گئے اور دروازہ بند کر لیا۔ لوگوں نے وہاں آ کر دروازہ کھٹکھٹایا اور آپؑ سے دوبارہ اصرار کرنے لگے ان لوگوں کے ہمراہ طلحہ وزبیر بھی تھے۔ ان لوگوں نے حضرت علی علیہ السلام سے عرض کیا: اس امر خلافت کا امیر کے بغیر باقی رہنا ممکن نہیں ہے اور وہ اس وقت تک دروازے سے نہیں ہٹے جب تک آپؑ نے خلافت کو قبول نہیں کر لیا۔''(۲)

جب حضرت علی علیہ السلام نے منصب خلافت کو قبول فرمایا اور مملکت میں وحدت امت اور امن واستقرار کی صورت حال کو بہتر بنانے کی خاطر جنگ جمل، صفین اور نہروان میں مخالفین کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مجبور ہوئے جبکہ وہ جنگیں آپؑ کے لئے دردناک اور گراں تھیں۔ اگر آپؑ کی یہ ذمہ داری نہ تھی کہ ان فتنوں کا قلع قمع کریں ورنہ آپؑ کو اپنے مخالفین کی طرح

۱۔ اسماعیل الشطی، الاسلام الذی نرید، جریدہ ''الشرق الاوسط'' میں ایک مقالہ، 7 جون 1998ء
۲۔ البدایہ والنھایہ، جلد 7، صفحہ 218

عہدوں اور منصبوں کا لالچ بالکل نہ تھا۔ جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا:

'' اَمَا وَالَّذِیْ فَلَقَ الْحَبَّةَ، وَ بَرَآ النَّسَمَةَ ، لَوْلَا حُضُوْرُ الْحَاضِرِ وَ قِیَامُ الْحُجَّةِ بِوَجُوْدِ النَّاصِرِ، وَمَا اَخَذَ اللّٰهُ عَلَی الْعُلَمَاءِ اِلَّا یُقَّارُوا عَلَی کَظَّةِ ظَالِمٍ، وَلَا سَغْبُ مَظْلُوْمٍ ، لَاَلْقَیْتُ حَبْلَهَا عَلَی غَارِبِهَا، وَلَسَقَیْتُ آخِرَهَا بِکَاسِ اَوَّلُهَا، وَلَا لَقِیْتُمْ دُنْیَاکُمْ هَذَا اَزْهَدُ عِنْدِی مِنْ عَفْطَةِ عَنْزٍ'' (۱)

'' آگاہ رہو! اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور جاندار پیدا کئے اگر بیعت کرنے والے موجود نہ ہوتے اور مددگاروں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے عالموں سے لیا ہے کہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی بھوک چپ چاپ نہ دیکھتے رہیں (بلکہ مظلوم کا حق ظالم سے دلوائیں) تو میں حکومت کی مہار اس کی پیٹھ پر ڈال کر آزاد کر دیتا اور اس کے آخر کو اسی پیالے سے سیراب کرتا جس پیالے سے اس کے اول کو سیراب کیا تھا اور تم دیکھ لیتے کہ تمہاری یہ دنیا میری نظر میں بکری کی چھینک سے بھی زیادہ ذلیل ہے''

صلح امام حسن علیہ السلام

حضرت امام علی علیہ السلام کے بعد باقی آئمہ ہدایت کا بھی حضرت علی علیہ السلام کی طرح طرزِ عمل تھا۔ حضرت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ کے ساتھ صلح کی حالانکہ حضرت امام حسن علیہ السلام شرعی خلیفہ تھے اور آپؑ کے والد گرامی کی شہادت کے بعد مسلمانوں نے آپؑ کی بیعت کی تھی اور آپؑ کی بیعت بھی آپؑ کے والد کی بیعت کی طرح اسلامی مملکت کے تمام شہروں کے افراد نے کی۔ تمام عراقی، ایرانی، حجازی اور یمنی لوگوں نے آپؑ کی بیعت کی تھی۔ جب آپؑ نے دیکھا کہ معاویہ آپؑ کو حکومت و خلافت کے تخت سے اتارنے پر اصرار کر رہا ہے اور وہ اپنے تخریبی حربوں سے ایسا کر سکتا تھا اور آپؑ نے دیکھا کہ اگر اس سے فوجی

۱۔ شریف رضی موسوی، نہج البلاغہ، خطبہ 3 پہلا ایڈیشن 1967ء (بیروت: دار الکتاب اللبنانی)

طرز پر مقابلہ کیا گیا تو اس کا مطلب ایک قبائلی اور عصبیت پر مبنی جنگ کے معرکہ میں داخل ہونا ہے اور اس جنگ کے نتائج آپؑ کے حق میں نہیں ہوں گے کیونکہ آپؑ کے مدمقابل نے ڈرانے اور لالچ دینے کے تمام طریقوں کو استعمال کرنا تھا ان تمام عوامل کی وجہ سے آپؑ نے حکومت کو ٹھکرا دیا اور صلح پر مائل ہوئے۔

حاکم نے جبیر بن نفیر سے روایت کی تخریج کی ہے کہ جبیر بن نفیر بیان کرتا ہے: ''میں نے حضرت امام حسن علیہ السلام سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں آپ خلافت کے طلبگار رہیں 'اس پر آپؑ نے جواب دیا' عرب کے گروہ میرے ہاتھ میں تھے وہ ہر اس شخص سے جنگ کرتے جس سے میری جنگ ہوتی اور وہ ہر اس سے صلح کرتے جس سے میری صلح ہوتی۔ لہذا میں نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور امت محمدیہؐ کے خون کو ناحق بہنے سے بچانے کی خاطر خلافت کو چھوڑ دیا۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام اور بنوامیہ کی خلافت

جب امت مسلمہ کے درمیان بنوامیہ کی حکومت زمین بوس ہو رہی تھی اور بنوعباس نے انکی حکومت وخلافت میں آخری کیل ٹھوکنے کیلئے اپنی تحریک میں جان ڈالی اور بنوعباس نے بنوامیہ کی حکومت کا خاتمہ کرنے کیلئے یہ نعرے بلند کئے کہ ہم اہل بیتؑ کی طرف دعوت دیتے ہیں' اور ہم اہل بیتؑ کے خون کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔ بنوعباس نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے عرض کی کہ آپ بھی ہماری تحریک اور انقلاب میں شامل ہو جائیں تا کہ آپؑ اس تحریک کے لیڈر اور قائد قرار پائیں لیکن امام جعفر صادق علیہ السلام نے انکار کر دیا۔(۱)

ابومسلم خراسانی جو بنوامیہ کے ساتھ جنگ میں پیش پیش تھا اور جرنیل کی حیثیت رکھتا تھا

۱۔ جلال الدین عبدالرحمٰن سیوطی، تاریخ الخلفاء، دوسرا ایڈیشن، صفحہ 227، 1994ء (بیروت: دارالجبل)

اس نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو خط میں تحریر کیا:

''میں نے کلمہ حق کا اظہار کیا اور لوگوں کو بنوامیہ سے اہلبیتؑ کا موالی اور حبدار بننے کی دعوت دی اب اگر آپؑ خلافت میں رغبت رکھتے ہوں تو آپؑ کو اس کیلئے مزید انتظار نہیں کرنا پڑے گا''

اس پر امام جعفر صادق علیہ السلام نے اسے جواب میں تحریر کیا:

''نہ تم میرے جوانوں میں سے ہو اور نہ یہ زمانہ میرا زمانہ ہے''(۱)

دوسری دفعہ بنوعباس کی تحریک کے سرکردہ رہنماؤں میں سے ایک رہنما ابوسلمہ خلال نے آپؑ کو اس تحریک کی قیادت اور صدارت کی پیشکش کی تو امام جعفر صادق علیہ اسلام نے اسے اور اس کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔(۲)

امام رضا علیہ السلام اور حکومت میں شرکت

عباسی خلیفہ مامون نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے اور اپنی حکومت کو شرعی چھتری فراہم کرنے کیلئے یہ ارادہ کیا کہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو حکومت میں شامل کیا جائے پھر اس نے آپؑ کو اپنا ولی عہد منتخب کیا۔لیکن امام رضا علیہ السلام نے اس کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔جب مامون کا اصرار اور دباؤ بڑھا تو آپؑ نے برائے نام حکومت میں شرکت کی اور فرمایا کہ وہ عملی طور پر کوئی تنفیذی ذمہ داری نہیں لیں گے۔

بعض تاریخی مصادر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ مامون نے امام رضا علیہ السلام کو یہ پیش کش کی کہ میں حکومت کو چھوڑ کر اسے آپؑ کے حوالے کرتا ہوں کہ آپؑ حکومت و خلافت سنبھال لیں لیکن آپؑ نے اس کی یہ پیشکش مکمل طور پر ٹھکرا دی۔ابن کثیر نے البدایہ والنھایہ میں بیان کیا ہے:

۱۔ باقری شریف قرشی،عصر الامام الصادقؑ ،پہلا ایڈیشن، صفحہ 77، 1413ھ(بیروت:دارالاضواء

۲۔ باقر شریف قرشی،عصر الامام الصادقؑ ،صفحہ 74

''مامون نے یہ عزم کیا کہ وہ حضرت امام رضا علیہ السلام کیلئے تخت خلافت چھوڑ دیتا ہے لیکن امام رضا علیہ السلام نے خلافت قبول کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے آپؑ کو اپنے بعد اپنا ولی عہد قرار دیا۔(۱)

حکومت کے بارے میں اہل بیت علیہم السلام کا موقف

اگر آئمہ اہل بیت علیہم السلام کی یہ رائے تھی کہ وہ دوسروں سے زیادہ امت کی قیادت کے حقدار اور اہل ہیں تو پھر انہوں نے حکومت حاصل کرنے کے مواقع کو غنیمت کیوں نہ سمجھا؟ وہ سیاسی عمل اور حکومت سے الگ تھلگ ہو کر کیوں زندگی بسر کرتے رہے؟ ہم آئمہ اہل بیت علیہم السلام موقف درج ذیل حقائق کی روشنی میں سمجھ سکتے ہیں۔

آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا پہلا اہم اور بنیادی کام رسالت کی حفاظت اور شریعت کا بیان کرنا ہے۔ البتہ حکومت و خلافت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ثانوی حیثیت رکھتا ہے تو یہ دوسرے نمبر پر اہم کام ہوگا اگر اس کا رسالت و شریعت کی حفاظت سے موازنہ کیا جائے۔ اگر دونوں اہم کام ٹکرا جائیں جیسا کہ لوگوں کے دلوں میں سیاسی طمع اور لالچ موجود تھی اور لوگوں کے اپنے مفادات کے جھگڑوں کے باعث آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے نزدیک پہلا کام اولویت رکھتا تھا۔

شیخ محمد مہدی شمس الدینؒ نے اس موضوع کے متعلق اپنی عربی کتاب '**نظام الحکم والادارہ فی الاسلام**'' میں ''**ماھیة الامامة ومسئولیة الامام الاولیٰ عند الشیعة**'' کے موضوع کے تحت علمی اور دلچسپ گفتگو فرمائی ہے۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ شیعہ امامیہ کے عقیدہ کے مطابق امامت کی ماہیت میں پہلا اہم ترین کام اسلام کے متعلق ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے عقائد اور شریعت کو اپنی اصلی حالت پر باقی رکھیں اور اس کی تبلیغ و تفسیر بیان

۱۔ البدایہ والنہایہ، جلد 1، صفحہ 265

کریں اور اسلام کی حفاظت کریں جبکہ سیاسی حکومت اور اس کی تنظیم سازی امام کے کاموں اور ذمہ داریوں میں دوسرے نمبر پر واقع ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کچھ قہری اسباب کی وجہ سے امام تک حکومت نہ پہنچ پائے تو اس سے امام کی امامت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ امام کا بنیادی اہم کام وحی کے بغیر نبوت کے کاموں اور ذمہ داریوں کو جاری وساری رکھنا ہے۔

امامت کے موضوع کے متعلق اہل بیت علیہم السلام سے وارد روایات اور نصوص کی جانچ پڑتال کرنے سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ان روایات میں امام کی پہلی ذمہ داری پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ امت اور دین کو امام کی ضرورت ہے اور آئمہ اہل بیت علیہم السلام کے علاوہ کوئی اور دین کی اس ضرورت کو پورا نہیں کرسکتا۔

امامت کا دوسرا پہلو کہ امام کا حکومت اور مملکت کیلئے قیام کرنا اس حوالے سے کم روایات اور نصوص ذکر کی گئی ہیں شیخ مہدی شمس الدین نے امام کے حوالے سے روایات کو اہل تشیع کے دو بنیادی مصادر شیخ کلینیؒ (متوفی 328ھ) کی کتاب ''الکافی'' اور شیخ صدوقؒ (متوفیٰ ۳۸۱ھ) کی کتاب ''علل الشرائع'' سے پیش کیا ہے کہ جن روایات میں امام کی پہلی ذمہ داری پر زور دیا گیا ہے وہ روایات کافی زیادہ ہیں اور بعض روایات اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ امام کی اس ذمہ داری کو ہی اولویت حاصل ہے۔(۱)

حکومت کے حصول کیلئے جائز راستہ

حکومت وسلطنت امامت کا حق ہے اور امامت کے اہداف کے حصول کیلئے حکومت ایک وسیلہ ہے بشرطیکہ حکومت کا حصول ضروری قوانین سے ہم آہنگ اور مطابقت رکھتا ہو۔ اس میں یہ شرط نہیں کہ ہر قیمت پر اور کسی بھی طریقے سے حکومت حاصل کی جائے اگرچہ یہ طریقہ اسلام کی

۱۔ محمد مہدی شمس الدین، نظام الحکم والادارۃ فی الاسلام، دوسرا ایڈیشن، صفحہ 362-1991325ء
(بیروت: الموسسہ الدولیہ)

اقدار اور احکام کے مخالف ہو۔

اسی لئے آئمہ طاہرین علیہم السلام نے حکومت تک پہنچنے کیلئے سیاسی نزاع کے دوران غیر مناسب اسلوب اور غلط طریقوں کو کبھی نہیں اپنایا اور وہ کبھی بھی اپنے لئے غلبہ اور طاقت کے بل بوتے پر حکومتی تخت حاصل کرنے پر راضی نہیں ہوئے اور انہوں نے کبھی اس مقصد کی خاطر سازشوں اور جاسوسوں کا سہارا نہیں لیا بلکہ اس حوالے سے ان کا موقف واضح اور صاف تھا اور وہ امت کے ارادہ اور اختیار کا احترام کرتے تھے اگر چہ کہ ایسا کرنے سے ان کو سیاسی طور پر نقصان اٹھانا پڑتا ہو اور ان کے مفادات ضائع ہوتے ہوں پس اس حوالے سے اصول اور قانون ہی ان کا وسیلہ اور ہدف تھا۔

اس حقیقت کی طرف حضرت امام علی علیہ السلام نے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''وَاللّٰهُ مَا مُعَاوِيَةَ بِاَدْهَى مِنِّیْ وَلٰكِنَّهُ يُغْدَرُ وَ يَفْجَرُ، وَلَوْلَا كَرَاهِيَةُ الْغَدَرِ لَكُنْتُ مِنْ اَدْهَى النَّاسِ''(۱)

''خدا کی قسم معاویہ مجھ سے زیادہ ہوشیار اور چالاک نہیں ہے مگر فرق یہ ہے کہ وہ غدار اور بدکردار ہے اگر مجھے غداری سے نفرت نہ ہوتی تو میں سب سے زیادہ ہوشیار اور موقع شناس ہوتا۔''

دوسرے مقام پر حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

''اَتَا مَرُوْنِیْ اَنْ اَطْلُبَ النَّصْرَ بِالْجَوْرِ فِيْمَنْ وَلَيْتَ عَلَيْهِ! وَاللّٰهِ لَا اَطُوْرُ بِهٖ مَا سَمَرَ سَمِيْرٌ، وَمَا اُمُّ نَجْمٍ فِی السَّمَاءِ نَجْمَاً''(۲)

''کیا تم مجھے یہ کہتے ہو کہ میں جن لوگوں پر حاکم ہوا ہوں ان پر ظلم (حق تلفی) کر کے لوگوں کی امداد حاصل کروں (یعنی طبقاتی تقسیم کر کے سنت رسولؐ کی مخالفت کروں) خدا کی

۱۔ نہج البلاغہ، خطبہ 200

۲۔ نہج البلاغہ، خطبہ 128

قسم جب تک دنیا کا قصہ چل رہا ہے اور ستارہ دوسرے ستارے کی طرف کھینچ رہا ہے میں ایسا بالکل نہیں کروں گا۔''

امام کے کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صرف اس صورت میں حکومت سنبھالتا اور امت کی قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیتا ہے جب امت بھی اس بات پر راضی اور خوش ہو جبکہ امام کبھی بھی قوت وطاقت اور غلبہ کے بل بوتے پر حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لیتا۔اس بارے میں حضرت امام علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے مجھ سے وعدہ لیتے ہوئے فرمایا: اے فرزند ابوطالبؑ! میری امت کی محبت ولاء آپؑ کیلئے ہے اگر چہ لوگ آپؑ کو خیر وعافیت سے حاکم اپنائیں اور اپنی خوشی سے آپ پر اتفاق اور اجماع کریں تو آپؑ ان کے امر کی اصلاح کیلئے قیام فرمائیں اور اگر یہ آپؑ کے متعلق اختلاف کا شکار ہوں تو آپؑ بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔''(۱)

وحدت امت

وحدت امت اور معاشرتی اتحاد واتفاق کیلئے سب سے خطرناک شئے سیاسی جھگڑے ہیں جنکی وجہ سے ایک امت کئی گروہوں میں تبدیل ہوجاتی ہے اور اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور داخلی جنگیں شروع ہوجاتی ہیں جسکی وجہ سے بے دریغ خون بہایا جاتا ہے اور حرمتوں کو پامال کردیا جاتا ہے اور معاشرے میں امن واستقرار ناپید ہوجاتا ہے۔آئمہ اہل بیت علیہم السلام کا یہ ایمان تھا کہ قیادت وحکومت ان کا حق ہے لیکن اسکے باوجود انہوں نے امت کو داخلی اختلافات اور خانہ جنگی سے بچانے کی خاطر اپنے اس حق کو زبردستی لینے سے اجتناب کیا کیونکہ آپؑ کو امت کی وحدت کی فکر لاحق تھی آپؑ امت کو سیاسی جھگڑوں اور طاقت کے بل بوتے پر حکومت و

۱۔ شیخ حسین علی منتظری، دراسات فی ولایۃ الفقیہ جلد 1 دوسرا ایڈیشن، صفحہ 505، 1988ء، (بیروت: الدار الاسلامیہ)

سلطنت کے حصول کی کوشش سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

ابن ابی الحدید نے اپنی شرح نہج البلاغہ میں حضرت امام علی علیہ السلام کا ایک خطبہ نقل کیا ہے جس میں آپؑ فرماتے ہیں:

''پس میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کے درمیان افتراق انتشار پیدا کرنے اور ان کا خون بہانے سے زیادہ بہتر صبر کرنا ہے جبکہ ابھی لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوئے تھے''(۱)

حضرت امام حسین علیہ السلام کی تحریک

سابقہ حقائق کی روشنی میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی تحریک اور قیام کو سمجھنا کیسے ممکن ہے؟ حضرت امام حسین علیہ السلام بھی باقی آئمہ اطہارؑ کی طرح وحدتِ امت کے خواہاں تھے اور وہ شرعی نہج پر چلنے والے اور ذاتی مفادات سے دور تھے آپؑ کی نظر میں بھی شریعت کی تبلیغ، اس کی حفاظت اور حمایت سب سے اہم تھی تو آپؑ کے دورِ امامت میں وہ سانحہ کیوں رونما ہوا جو باقی آئمہ اطہارؑ کے دور میں رونما نہیں ہوا کہ آپؑ کا حکومت سے تصادم ہوا اور آپؑ کو دردناک انداز میں شہید کر دیا گیا؟

جو شخص تاریخ کے اس ٹکڑے کا مطالعہ کرتا ہے اور اس دور کے واقعات و حالات میں غور و فکر کرتا ہے تو وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ وہ استثنائی حالت و کیفیت ہے اس کو جاننے کیلئے درج ذیل امور کو ملاحظہ کرنا ضروری ہے۔

۱۔ یزید بن معاویہ کو اپنے باپ سے وراثت میں حکومت ملی اور یہ وہ نیا انداز تھا جو امت کے طریقہ کار کے برعکس تھا۔

۲۔ یزید کا کردار برائی کا محور و مرکز تھا وہ کھلم کھلا گناہوں اور انحراف کا مرتکب ہوتا۔ مورخین نے

۱۔ عبدالحمید بن ابی الحدید، شرح نہج البلاغہ جلد 1، صفحہ 308، 1987ء (بیروت: دارالجیل)

اس حوالے سے نقل کیا ہے اور ان مورخین میں طبری بھی ہے جس نے یہ نقل کیا ہے:

''مدینہ والوں کا ایک وفد یزید بن معاویہ کے پاس (شام) گیا اس وفد میں عبداللہ بن حنظلہ انصاری (غسیل الملائکہ) عبداللہ بن ابی عمرو اور منذر بن زبیر سمیت مدینہ کے کافی سردار شامل تھے۔ یزید نے ان لوگوں کی عزت و توقیر کی اور ان سے اچھا برتاؤ کیا اور انہیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا پھر منذر بن زبیر کے سوا تمام لوگ یزید کے پاس سے واپس مدینہ آئے اور انہوں نے یزید اور عتبہ کو برا بھلا اور سب وشتم کرتے ہوئے کہا: ''ہم ایک ایسے شخص کے پاس سے آئے ہیں جس کا کوئی دین نہیں ہے وہ شراب پیتا اور ساز بجاتا ہے وہ کتوں سے کھیلتا ہے اور لفنگوں اور لونڈیوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے۔''(۱)

۳۔ امت اسلامیہ نے وسیع پیمانے پر حضرت امام حسین علیہ السلام سے امیر خلافت کیلئے اپنا کردار ادا کرنے کی درخواست کی ان میں کوفہ والوں کی کثیر تعداد تھی جبکہ کوفہ والوں کی تاریخ جنگوں سے بھری پڑی ہے۔ آپؑ کو ان لوگوں کے ہزاروں خطوط آئے اور کئی وفود آپؑ کی خدمت میں اس کام کیلئے حاضر ہوئے اور انہوں نے آپؑ کو اپنے پاس آنے کی پرجوش دعوت دی اور انہوں نے آپؑ کی بیعت کرنا قبول کیا جس کی وجہ سے امام حسین علیہ السلام کے سامنے ایک شرعی ذمہ داری تھی جبکہ آپؑ کے والد حضرت علی علیہ السلام اور آپؑ کے برادر حضرت امام حسن علیہ السلام کے بعد کسی اور امام کیلئے اس قدر عوام نے بیعت اور امر خلافت کیلئے اصرار نہیں کیا۔ حضرت امام علی علیہ السلام اور حضرت امام حسن علیہ السلام نے بھی لوگوں کے اصرار پر امر خلافت سنبھالنے کو قبول کیا تھا اور ان دونوں ہستیوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی سرانجام دیا۔ پس درج بالا مذکور تمام حالات واقعات کے تحت حضرت امام حسین علیہ السلام کے پاس اسکے علاوہ

۱۔ تاریخ طبری، جلد 4 صفحہ 368

اور کوئی راستہ نہ تھا کہ آپؑ ان لوگوں کی دعوت کو قبول فرمائیں۔ ورنہ آپؑ کا تاریخ اور امت کے سامنے محاسبہ کیا جانا تھا کہ آپؑ نے لوگوں کی دعوت کو ٹھکرا دیا پس اس صورت میں امام حسین علیہ السلام اس فرصت کو کیسے کھو دیتے اور اپنی ذمہ داری ادا نہ کرتے؟۔ امام کو نتائج سے آگاہی ہونے کی بناء پر ظاہری امور پر عمل نہ کرنے سے بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔

۴۔ حالات کی تمام تر سنگینی کے باوجود حضرت امام حسین علیہ السلام نے اموی لشکر کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی نہیں اپنائی بلکہ آپؑ نے کئی دفعہ ان کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ وہ آپؑ کا راستہ چھوڑ دیں تا کہ آپؑ کسی اور جگہ یا مدینہ واپس لوٹ جائیں لیکن اموی لشکر نے اصرار کیا کہ آپؑ ان کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوئے ذلت و رسوائی سے یزید کی بیعت کر لیں (نعوذ باللہ)۔ جب آپؑ نے اس ذلت و رسوائی کو ٹھکرا دیا تو انہوں نے آپؑ پر مسلح حملہ کر دیا۔

اموی لشکر کا پہلا گروہ جو حر بن یزید ریاحی کی قیادت میں تھا اور اس کا آپؑ سے آمنا سامنا ہوا تو آپؑ نے ان کے سامنے اپنے پہلے خطبہ میں ارشاد فرمایا:

''جب تم لوگوں کے خطوط میرے پاس آئے کہ آپؑ ہمارے پاس تشریف لائیں تو میں تمہارے پاس آیا ہوں تم نے ان خطوط میں تحریر کیا تھا کہ اس وقت ہمارا کوئی امام و پیشوا نہیں ہے لہٰذا آپ ہمارے پاس آئیں تا کہ اللہ آپؑ کے وجود کے صدقہ میں ہمیں ہدایت پر جمع فرمائے۔ پس اگر اب بھی تم اس نظریئے پر قائم ہو تو میں تمہارے پاس آ گیا ہوں اور اگر تم کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں واپس چلا جاتا ہوں'' (۱)

آپؑ نے عاشور کے دن خطبہ میں فرمایا:

۱۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین ابن علی، جلد 3 پہلا ایڈیشن، صفحہ 75، 1993ء (بیروت: دار البلاغہ)

''اے لوگو! اگر تم کو میرا آنا پسند نہیں ہے تو میرا راستہ چھوڑ دو اور میں یہاں سے کسی ایسی جگہ کی طرف چلا جاتا ہوں جو میرے لئے امن کی جگہ ہو۔''(۱)

تاریخ کی بعض کتب میں مذکور ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور یزیدی لشکر کے سالار عمر ابن سعد کے درمیان ہونے والی ملاقاتوں کے نتیجہ میں اس بات پر اتفاق ہو گیا تھا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام مکہ یا مدینہ یا کسی اور علاقہ کی طرف چلے جائیں۔ عمر ابن سعد نے یہ بات ابن زیاد کو خط میں لکھ بھیجی اور ہو سکتا تھا کہ ابن زیاد بھی اس بات سے اتفاق کر لیتا لیکن شمر بن ذی الجوشن نے اس سارے معاملے کو بگاڑ دیا اور ابن زیاد کو اس بات پر ابھارا کہ وہ یہ تجویز مسترد کر دے اور جنگ پر اصرار کرے۔(۲)

علویوں کی تحریکیں

علویوں کی تحریکوں میں سے کسی تحریک کی قیادت آئمہ اطہارؑ میں سے کسی امام نے نہیں کی بلکہ بسا اوقات آئمہ اطہارؑ ان تحریکوں کے قائدین اور سرداروں کو یہ نصیحت فرماتے تھے کہ وہ ٹکراؤ اور مسلح بغاوت کی پالیسی سے گریز کریں لیکن حکمرانوں کی طرف سے علویوں اور ان کے ماننے والوں پر جو سختی اور ظلم روا رکھا گیا اس وجہ سے علوی اس راستے پر چلتے تھے جو بالآخر تصادم اور دو بدو جنگ پر اختتام پذیر ہوتا۔ اگر ان تحریکوں میں سے ہر تحریک کا غیر جانبداری اور واقعیت کی نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کو شروع کرنے میں بیرونی حالات و واقعات کا بہت زیادہ اثر تھا۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان تحریکوں سے آئمہ طاہرینؑ نے احتیاط اور دوری کی پالیسی اپنائی اور آپؑ کا ان تحریکوں سے ڈائریکٹ کوئی کردار نہ تھا اور نہ ہی آپؑ نے ان کی تائید فرمائی۔ یقینی طور پر آئمہ اطہارؑ ان تحریکوں کے اسباب سے بخوبی آگاہ تھے اور جب

۱۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین بن علیؑ، صفحہ 187

۲۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسین ابن علی، جلد 3 پہلا ایڈیشن، صفحہ 130-128 1993ء (بیروت: دار البلاغہ)

ان تحریکوں سے وابستہ افراد کو شہید کر دیا جاتا تو یہ آپؑ کیلئے المناک ہوتا اور آپؑ کے مخلص افراد کو تہ تیغ کرنا آپؑ کیلئے تکلیف دہ مرحلہ ہوتا تھا۔

شعور و دانشمندی کا معرکہ

آئمہ معصومین علیہم السلام ظاہری طور پر موجود حکومتوں کے ساتھ تصادم اور ٹکراؤ کی پالیسی نہیں رکھتے تھے اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے کہ آپؑ نے اپنی ذمہ داریوں سے ہاتھ اٹھالیا تھا یا آپؑ نے سیاسی حالات و واقعات میں اپنے کردار کو ختم کر دیا تھا۔ بلکہ آپؑ زندگی کے مختلف میدانوں میں اسلام کے مفاہیم اور قوانین کو واضح طور پر بیان کرنے کا بہت زیادہ اہتمام کرتے۔

سیاسی حالات کی اپنی حقیقت اور اس کی دینی اہمیت ہے۔ لہٰذا آئمہ طاہرین علیہم السلام نے اس حوالے سے امت کو اپنی ذمہ داریوں کا شعور اور احساس دلایا۔ آپؑ نے اسلام کے ان اصولوں اور اقدار کو واضح کیا جن پر سیاسی حکومت قائم ہوتی ہے، آپؑ نے عوام کے حقوق سے تجاوز اور ظلم و استبداد سے ڈرایا اور متنبہ کیا امت کی اکثریت کو درپیش مسائل کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں سنبھالنے کا سبق دیا۔

لوگوں کو شرعی قیادت کی صفات اور مطلوبہ معیار سے آگاہی دی یوں آپؑ کے ہاتھوں پر ایسی صاحب ایمان نسلیں تیار ہوئیں جو آپؑ کے راستے پر گامزن رہنے والی تھیں۔ آپؑ نے امت اسلامیہ میں ایسی عوامی طاقت اور افراد تیار کئے جو آپؑ کی امامت اور مرجعیت سے وابستہ تھے۔ آئمہ اطہارؑ پر حکومتی دباؤ اور مشکلات کے باوجود آپؑ نے وسیع پیمانے پر ایسے افراد کی تربیت کی اور انہیں مختلف علاقوں میں پھیلا دیا تاکہ وہ دوسرے لوگوں کو بھی آئمہ اطہارؑ سے تعلیم کردہ اسلامی مفاہیم و قوانین سے روشناس کرائیں۔ آپؑ نے تمام انسانیت اور امت کیلئے سیاسی عمل میں روشن مثال پیش کی کہ آپؑ سیاست میں بھی انسانی و اسلامی اقدار اور اصولوں کی پاسداری کرتے اور ذاتی مفاد کے سیاسی جھگڑوں میں اسلام کے حقیقی نظریہ کی حفاظت کرتے۔

آئمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے کی حکومتیں

آئمہ اطہار علیہم السلام کے زمانے کی حکومتیں

آئمہ اہل بیت علیہم السلام نے اڑھائی سو سال جن حکومتوں کے سائے میں زندگی بسر کی ہے آپؑ کے ان حکومتوں کے ساتھ کیسے تعلقات تھے؟ اور ان کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا؟

کیا آپؑ نے ان حکومتوں کے خلاف مسلح جدوجہد کا اعلان کر رکھا تھا؟ یا آپؑ نے سیاسی میدان خالی چھوڑ رکھا تھا اور خود کو صرف عبادت اور علمی سرگرمیوں میں مشغول رکھتے تھے؟

یا آپؑ کسی حد تک موجود سیاسی حکومت کے ساتھ معاملات اور تعلقات قائم رکھتے تھے؟

آئمہ اطہار علیہم السلام کے نزدیک دین کی امامت اور امت کی قیادت ایک الٰہی منصب ہے جو صرف اہلیت اور قابلیت کی بنیاد پر ملتا ہے۔

امام کا تعین اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے امامت کا عہدہ انہیں (آئمہ اہل بیتؑ) کو عطا کیا تھا کیونکہ امامت کی شرائط آپؑ کے اندر موجود تھیں۔ لہٰذا جن افراد نے بھی حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لی انہوں نے آئمہؑ کے ان حقوق اور مقامات کو غصب کیا جو اللہ تعالیٰ نے ان کیلئے قرار دیئے تھے۔

جیسا کہ بنوامیہ اور بنوعباس کے حکمران امت اسلامیہ کی خوشی، رغبت اور ارادہ و اختیار سے حکومت کے منصب پر نہیں آئے تھے بلکہ انہوں نے طاقت اور غلبے کے بل بوتے پر اور خاندانی بغاوت و شورش برپا کر کے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی اور وہ حکمران شریعت کی تعلیمات اور عدل

کے اصولوں کے مطابق بالکل بھی حکومت نہیں چلاتے رہے ہیں۔

اس لحاظ سے طبیعی طور پر آئمہ اطہارؑ کا موقف ان حکومتوں کے مخالف تھا کہ جو حکومتیں آپؑ پر مختلف طریقے سے دباؤ ڈالتی رہیں کہ آپؑ ان کے طریقہ کار کی مخالفت جو کرتے تھے۔ آئمہ اطہارؑ کا اپنے زمانے کی حکومتوں کی مخالفت کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آپ نے ان حکومتوں کے خلاف پر تشدد کاروائیوں اور مسلح بغاوت پر لوگوں کو اکسایا ہو جیسا کہ خوارج اور زیدی فرقہ کی رائے ہے۔ کیونکہ آئمہ اطہارؑ کے نزدیک یہ طریقہ کار درست نہیں ہے سوائے اضطراری حالت میں کہ جس کو استثنائی ظرف کے طور پر فرض کیا جاتا ہے۔

اسی طرح آئمہ اطہار علیہم السلام نے اپنے لئے اس طریقہ کو بھی اختیار نہیں کیا تھا کہ آپؑ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہو اور امت کے مسائل سے الگ تھلگ ہو گئے ہوں بلکہ آپؑ کی سیرت اور تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؑ مختلف میدانوں میں ہر وقت متحرک رہتے اور امت اسلامیہ کے مسائل کو حل کرنے کیلئے میدان میں موجود ہوتے اور آپؑ اس حوالے سے اپنے زمانے کی حکومت کے ساتھ تعاون بھی کرتے تھے۔

باہمی تعاون کی ضرورت

آئمہ معصومین علیہم السلام اپنے زمانے کی حکومتوں کی مخالفت اور حکمرانوں کی شخصیات پر اعتراضات اور تحفظات کے باوجود بعض اوقات اس زمانے کی صورتحال کے مطابق معاملہ کرتے تھے کیونکہ زیادہ تر ایسا کرنا ضروری ہو جاتا تھا کہ اہلبیت علیہم السلام کے پیروکاروں کے اجتماعی وجود کو بچایا جا سکے اور ان کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔

پس آئمہ طاہرین علیہم السلام اور ان کے شیعہ معاشرے کا حصہ ہونے کی وجہ سے ان کی کچھ معاشی ضروریات اور عملی مفادات تھے جن کی خاطر حکومت سے ایک خاص حد تک تعلق اور رابطہ رکھنا ضروری ہوتا تھا تا کہ ان کی معاشی ضروریات کو پورا کیا جا سکے اور ان کے مفادات کو بچایا

جا سکے۔ کیونکہ حکومت ایک مرکزی طاقت رکھتی تھی اور اس کے ساتھ ہر سطح پر معاملات کو بگاڑ کر لوگوں کے بہت سے کاموں کو چلانا کافی مشکل تھا۔

شیعیان اہلبیت علیہم السلام سے یہ ہرگز مطلوب نہیں ہے کہ وہ ہر صورت میں سختی تنگی اور مشکلات ومصائب میں ہی زندگی بسر کریں اور اپنی مشکلات کو دور کرنے کیلئے کوئی راستہ نہ نکالیں۔

شریعت اسلامیہ کا یہ قانون ہے کہ مکلفین سے مشکلات اور تنگی کو دور کیا جائے جیسا کہ ارشاد پروردگار ہے:

''یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (۱)

''اللہ تمہارے لئے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لئے سختی ومشکل نہیں چاہتا ہے''

اور ارشاد ربانی ہوتا ہے۔

''وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ حَرَجٌ (۲)

''خدا نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی ہے''

تقیہ کے احکام جن کا مطلب اپنی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کرنا ہے اس حقیقت پر شاہد ہے کہ تقیہ کے احکام جو فقہی کتب میں مذکور ہیں ان میں یہ تمام تفصیلات موجود ہیں۔

دوسرے زاویہ نظر سے یہ جاننا ضروری ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کیلئے یہ چیز اہم تھی کہ وہ اسلام اور امت اسلامیہ کے مفادات کی حفاظت کریں اگر ان ہستیوں سے قیادت اور رہبری کا حق اور حکومت کو چھین لیا گیا تھا تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ دین اور اسلامی معاشرہ کی عام مصلحت اور مسائل کی بالکل بھی پرواہ نہ کریں۔

۱۔ سورہ بقرہ آیت 185

۲۔ سورہ الحج: آیت نمبر 78

اس لئے آئمہ معصومین علیہم السلام مسلمانوں کے مفادات کے ممکنہ تحفظ اور بہتری کیلئے ہر ممکن کردار ادا کرتے اور اس بارے میں اپنی رائے بیان کرتے تھے اور عام امور کیلئے حکومت سے رابطہ رکھنے میں تردد نہیں کرتے تھے۔ پس آئمہ معصومین علیہم السلام حکمرانوں کی بعض سیاسی آراء و اقدامات کو درست کرنے اور ان کے موقف کی ہدایت کرنے، صحیح رائے پیش کرنے، اسلامی مفاہیم اور شرعی احکامات بیان کرنے کیلئے ان کی حکومتوں سے تعاون کرتے تھے۔

امامت کی ذمہ داریاں اور جذباتی تعلق

آئمہ معصومین علیہم السلام اپنے تصرفات اور تعلقات میں جذباتی نہیں ہوتے اور نہ ہی یہ ہستیاں صرف اپنے ذاتی مفادات اور فوائد کو مدنظر رکھتی ہیں بلکہ ان کے نزدیک امامت کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اور امت اسلامیہ کی مصلحت کو مدنظر رکھنا اولویت رکھتا ہے۔ اس لئے ان ذوات مقدسہ کے ساتھ جو بدسلوکیاں اور ظلم و زیادتی ہوئی ہوں یہ امور آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرف سے عوام کی خدمت اور مصلحتوں میں رکاوٹ نہیں بنتے۔

آئمہ طاہرین علیہم السلام کو خلافت سے دور کرنے اور ان کے بعض مادی و معنوی حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کی وجہ سے ہرگز ایسا نہیں تھا کہ ان امور کے زنج و غم کو آئمہ اطہار علیہم السلام نے اپنے دلوں پر اس قدر لے لیا ہو کہ آپؑ نے مکمل طور پر حکمرانوں کا بائیکاٹ کر دیا ہو یا ان کے ساتھ شخصی کینہ اور کدورت کے ساتھ معاملات کرتے ہوں اور انتقامی ردعمل دکھاتے ہوں۔

جب حضرت عثمان کی بیعت کی گئی تو حضرت امام علی علیہ السلام نے فرمایا:

''لَقَدْ عَلِمْتُمْ اَنِّی اَحَقُّ النَّاسَ بِهَا مِنْ غَيْرِیْ ، وَ وَاللّٰهِ لَاَسْلِمُنَّ مَا سَلَمَتْ اُمُوْرَ الْمُسْلِمِيْنَ ، وَلَمْ يَكُنْ فِيْهَا جَوْرٌ اِلَّا عَلَیَّ خَاصَةً، اِلْتِمَاساً لِاَجْرِ ذٰلِکَ وَ فَضْلِهِ ، وَ زُهْدًا فِيْمَاتَنَا فَسْتُمُوه مِنْ زُخْرُفِهِ وَ زُبَرَجِهٖ''(۱)

۱۔ نہج البلاغہ: خطبہ نمبر 74

تم جانتے ہو کہ مجھے اوروں سے زیادہ خلافت کا حق پہنچتا ہے۔

خدا کی قسم! جب تک مسلمانوں کے امور کا نظم ونسق برقرار رہے گا اور صرف میری ہی ذات ظلم و جور کا نشانہ بنتی رہے گی میں خاموشی اختیار کرتا رہوں گا تا کہ (اس صبر پر) اللہ سے اجر و ثواب طلب کروں اور اس زیب وزینت اور آرائش کو ٹھکرادوں جس پر تم مرمٹے ہوئے ہو۔

بعض لوگ یہ غلط تصور رکھتے ہیں کہ آئمہ اطہارؑ ہمیشہ حکمرانوں کے بارے میں شخصی غضب وغصہ کے ساتھ زندگی گزارتے تھے اور جو لوگ یہ غلط تصور رکھتے ہیں ان کے مطابق آئمہ اطہارؑ نے اس غضب وغصہ کی وجہ سے کبھی اپنے بچوں کے نام ان خلفاء اور حکمرانوں کے نام پر نہیں رکھے تھے۔ اگر ہم آئمہ اطہارؑ کی سیرت وتاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے اپنے بچوں کے نام ان اسماء جیسے رکھے ہوئے تھے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام جنہوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کے دور حکومت میں زندگی بسر کی اور اس نے آپؑ پر بہت ظلم اور سختیاں کیں یہاں تک کہ آپ اس کے قید خانے میں شہید ہوگئے لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام ہارون تھا اور ایک اور بیٹے کا نام عبیداللہ تھا۔ اسی طرح آپؑ کی ایک بیٹی کا نام عائشہ تھا۔(۱)

حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام عبیداللہ تھا۔(۲)

حضرت امام علی زین العابدین علیہ السلام کی اولاد میں سے ایک بیٹے کا نام عمر اور دوسرے کا عبدالرحمٰن تھا۔(۳)

۱۔ شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان، الارشاد فی معرفۃ حج اللہ علی العباد جلد۲ صفحہ ۲۴۴ دوسرا ایڈیشن ۱۴۱۴ھ (بیروت: دار المفید تحقیق موسسہ آل البیت لتحقیق التراث)

۲۔ کتاب ''الارشاد'' ص ۱۷۶

۳۔ کتاب ''الارشاد'' ص ۱۵۵

حضرت امام حسین علیہ السلام کی اولاد میں بھی درج ذیل نام کے بیٹے موجود ہیں۔عمر، عبدالرحمٰن، طلحہ(۱)، ابوبکر(۲)۔اسی طرح حضرت امام علی ابن ابیطالبؑ کی اولاد میں سے ایک بیٹے کا نام عمر، دوسرے کا نام عثمان تھا۔اور آپؑ کے ایک بیٹے کی کنیت ابوبکر تھی۔(۳)

خاندان اہلبیت علیہم السلام اور بعض خلفاء حکمرانوں کے خاندانوں کے درمیان شادی و رشتہ ازدواج کے ذریعے بھی تعلقات قائم تھے۔جیسا کہ حضرت امام علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر کی وفات کے بعد ان کی بیوہ جناب اسماء بنت عمیس کے ساتھ شادی کی اور حضرت ابوبکر کے بیٹے جناب محمد بن ابی بکر جن کی پرورش امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کی آغوش میں ہوئی۔

حضرت امام حسین علیہ السلام نے لیلیٰ بنت ابی مرۃ بن عروۃ بن مسعود ثقفی سے شادی کی جبکہ جناب لیلیٰ، ابوسفیان بن حرب بن امیہ کی نواسی ہیں۔ان کی والدہ کا نام میمونہ ہے جو کہ ابوسفیان کی بیٹی ہیں۔اس رشتے کی مناسبت سے معاویہ، حضرت علی اکبر کی والدہ جناب لیلیٰ کا ماموں اور یزید ماموں کا بیٹا تھا۔حضرت علی اکبر علیہ السلام کی اموی خاندان ساتھ کے رشتہ داری کی وجہ سے عمر ابن سعد نے شب عاشورا اپنے کچھ ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کو جناب علی اکبرؑ کے پاس بھیجا جس نے آپ سے کہا:

آپؑ کی یزید سے رشتہ داری ہے لہٰذا ہمیں اس رشتہ داری کا خیال ہے اور اگر آپؑ چاہیں تو ہم آپؑ کو امان دیتے ہیں۔یہ سن کر حضرت علی اکبر علیہ السلام نے اس سے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ رشتہ داری اس بات کا زیادہ تقاضا کرتی ہے کہ تم

۱۔ کتاب ''الارشاد'' ص ۲۰

۲۔ ابوالفرج اصفہانی، مقاتل الطالبیین ص ۹۱ (بیروت، دار المعرفۃ، شرح وتحقیق: السید احمد الصقر)

۳۔ الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد جلد ۱، صفحہ ۳۵۴

لوگ رسولؐ سے رشتہ داری کا خیال کرو۔''(۱)

اسی طرح حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی والدہ ام فروہ بنت قاسم بن محمد بن ابی بکر ہیں جو کہ خلیفہ اول حضرت ابوبکر کی پڑپوتی ہیں۔ جناب ام فروہ کی والدہ کا نام اسماء بنت عبدالرحمٰن بن ابوبکر ہے۔ اسی وجہ سے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے یہ قول مروی ہے کہ ''ولقد ولدنی ابوبکر مرتین''، یعنی مجھے ابوبکر سے دوہری ولادت حاصل ہوئی۔(۲)

درج بالا تمام امور اس بات کی تاکید کرتے ہیں کہ آئمہ اطہارؑ کا اپنے زمانوں میں خلفاء اور حکمرانوں سے تعلق شخصی جذبات سے بلند و برتر تھا۔ اس کے ساتھ ان حکومتوں سے آئمہ اطہارؑ کا اصولی موقف بھی واضح اور آشکار ہے لیکن آپؑ نے اپنے بلند و بالا اخلاق اور مصلحت عامہ کے تحفظ کی خاطر ان خلفاء اور حکمرانوں سے تعلقات اور معاملات کو استوار رکھا۔

خلفاء و حکمرانوں سے میل جول

آئمہ اطہار علیہم السلام کا اپنے زمانے کی حکومتوں کے ساتھ ابتدائی اور اصولی موقف یہ تھا کہ آپ نے ان حکومتوں کا حصہ بننا قبول نہیں کیا تاکہ یوں ان حکومتوں کی آپؑ کی طرف سے تائید نہ ہو۔ آپؑ کے پیروکاروں کیلئے آپؑ کا یہ موقف اور نظریہ واضح ہے۔ لیکن تاریخ نے آئمہ اطہارؑ کی سیرت و تاریخ کے حوالے سے ایسے حالات و واقعات بھی نقل کئے ہیں کہ آپؑ نے اپنے زمانے کے حکمرانوں سے ملاقاتیں اور میل جول رکھا ہے۔ ان میں سے بعض ملاقاتیں ان حکمرانوں کے ارادے اور خواہش کی وجہ سے ہوئیں اور بعض میں آئمہ اطہارؑ کی طرف سے پہل کی گئی۔ تاریخ روایات کے سیاق و سباق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان ملاقاتوں کا مقصد آئمہ اور ان کے

۱۔ حیاۃ الامام الحسینؑ بن علیؑ، جلد۳ صفحہ ۲۴۴

۲۔ علی ابن عیسی اربلی، کشف الغمہ جلد۲ صفحہ ۳۷۴ (بیروت: دارالاضواء)

شیعوں پر دباؤ کم کرنا، حکمرانوں کو وعظ ونصیحت کرنا اور امامت کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کرتے ہوئے امت اسلامیہ کی مصلحتوں کی خدمت کرنا تھا۔

شیخ باقر شریف قرشی نے اپنی کتاب ''حیاۃ الامام الحسنؑ بن علیؑ'' میں تحریر کیا ہے: اکثر مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام، معاویہ کے پاس دمشق تشریف لے گئے تھے لیکن ان میں اس بات پر اختلاف موجود ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام ایک بار گئے تھے یا کئی بار گئے تھے۔(۱)

شیخ باقر شریف قرشی نے اپنی کتاب ''حیاۃ الامام محمد باقرؑ'' میں اموی خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے امام باقر علیہ السلام کو دمشق مدعو کرنے کے بارے میں تحریر کیا ہے اور وہ مزید لکھتے ہیں:

''حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے عمر بن عبدالعزیز کی دعوت کو قبول کر لیا اور آپؑ نے دمشق کی جانب سفر کیا اور دمشق میں عمر بن عبدالعزیز نے آپؑ کا پرتپاک استقبال کیا اور وہ ننگے پاؤں آپ کے ساتھ چلتا رہا آپ دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی اور امام کئی دنوں تک اس کی میزبانی میں رہے۔''(۲)

باقر مجلسی نے بحار الانوار میں قرب الاسناد سے نقل کرتے ہوئے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے ہارون الرشید کی ماں خیزران کو خط تحریر کیا جس میں اسے اس کے بیٹے عباسی خلیفہ موسیٰ ہادی کی وفات پر تعزیت پیش کی اور اسکے بیٹے ہارون کو خلیفہ بننے پر مبارکباد پیش کی۔(۳)

اسی طرح شیخ صدوق نے اپنی کتاب ''عیون الاخبار الرضا'' میں وہ واقعہ تفصیلاً لکھا ہے کہ

۱۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام الحسن بن علی جلد 2 صفحہ 303 تیسرا ایڈیشن 1393ھ (قم: دار الکتب العلمیہ)

۲۔ باقر شریف قرشی، حیاۃ الامام محمد الباقر، جلد 2 صفحہ 51 پہلا ایڈیشن 1993ء (بیروت: دار البلاغہ)

۳۔ بحار الانوار جلد 48 صفحہ 134

جب ہارون الرشید حج پر گیا تو وہاں سے مدینہ آیا تو حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس سے ملاقات کیلئے تشریف لے گئے تو ہارون الرشید نے آپؑ کی تعظیم و توقیر کی اور آپؑ کو کچھ مال دیا۔(۱)

امام کی زندگی اس قسم کے حالات و واقعات سے خالی نہیں ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ حکمرانوں سے میل جول رکھتے تھے۔

خلفاء کو نصیحت اور رائے پیش کرنا

یہ ایک فطری بات ہے کہ خلفاء حکمرانوں اور امت کو نئی اسلامی مملکت کے امور چلانے اور نئے اسلامی معاشرے کیلئے مشکلات اور چیلنجز کا سامنا تھا۔ وہاں دوسری امتوں کی ثقافتوں سے ٹکرانے کی وجہ سے کئی فکری، نظریاتی اشکالات پیدا ہوئے۔ معاشرتی امور اور نظام زندگی میں کئی نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑا جو اسلام کی صحیح رائے اور احکام کے استنباط کا محتاج تھا۔ اسی طرح نئی مملکت کے قیام اور مختلف داخلی و خارجی امور میں حکومت کے موقف کو کئی چیلنجز کا مقابلہ تھا جس سے خطرناک سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ آئمہ اہلبیت علیہم السلام اپنی علمی برتری روشن بصیرت اور دین و امت کیلئے اخلاص کی بناء پر ان شکالات کے جوابات دینے اور ان چیلنجز کا مقابلہ کرنے کی سب سے زیادہ طاقت رکھتے تھے۔

یہ ایک ضروری امر ہے کہ آئمہ اطہارؑ دین اور امت اسلامیہ کیلئے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہیں اور اس خلاء کو پر کرنے اور مشکلات کا ہر ممکن طریقے سے علاج معالجہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگرچہ آپؑ عملی طور پر حکومت اور قیادت سے دور تھے لیکن پھر بھی آپؑ نے حکومت کو درپیش چیلنجز سے نمٹنے، اسلامی مملکت کی مدد اور اصلاح کیلئے کبھی بھی ان حکمرانوں کو اپنی رائے اور مشورہ دینے سے بخل سے کام نہیں لیا۔

۱۔ محمد بن علی بن بابویہ القمی، عیون الاخبار الرضا جلد 2 صفحہ 84 پہلا ایڈیشن 1984ء (بیروت: موسسہ الاعلمی للمطبوعات)

تاریخی مصادر میں کئی ایسے موقف بیان کئے گئے ہیں جن میں خلفاء اور حکمرانوں نے آئمہ اطہارؑ سے خود مشورہ اور رائے طلب کی تو انہوں نے انہیں اپنی قیمتی آراء سے نوازا یا کبھی مصلحت عامہ کو مدنظر رکھتے ہوئے آئمہ اطہارؑ نے خود مشورہ اور رائے دینے میں پہل کی۔

حضرت علی علیہ السلام اور خلفاء

اس عنوان کے تحت ایک عراقی معاصر عالم دین شیخ نجم الدین عسکری نے ایک قیمتی کتاب تالیف فرمائی ہے جو کہ 1380ھ میں شائع ہوئی اور اس کتاب کے 324 صفحات ہیں۔ مئولف نے اس کتاب میں شیعہ سنی تاریخی اور احادیث کے مصادر پر اعتماد کرتے ہوئے ان تمام موارد اور مقامات کو جمع کیا ہے کہ جب خلفاء مختلف میدانوں میں مشکلات اور چیلنجز کا سامنا کرتے تھے تو حضرت علی علیہ السلام انہیں اپنی قیمتی آراء اور مشورے سے نوازتے تھے۔ اس عالم دین نے خلیفہ اول حضرت ابوبکر کے دور خلافت کے ایسے دس واقعات و موارد کو بیان کیا ہے کہ جب حضرت علی علیہ السلام نے ان کی مشکل کشائی کرتے ہوئے انہیں اپنے قیمتی مشورے سے نوازا۔

ان موارد میں سے ایک انہوں نے تاریخ یعقوبی سے درج ذیل واقعہ نقل کیا ہے:

جب حضرت ابوبکرؓ نے روم کی جنگ کیلئے ارادہ کیا تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کی ایک جماعت سے مشاورت کی تو بعض نے جنگ کرنے اور بعض نے جنگ نہ کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر آپ نے حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا تو انہوں نے جنگ کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا۔ اگر آپ نے جنگ کی تو اس معرکہ میں کامیاب ہوں گے یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے کہا: آپؑ نے خیر و بھلائی کی بشارت دی ہے۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے لوگوں میں کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور انہیں روم کی طرف سفر کرنے کیلئے آمادہ ہونے کا حکم دیا۔(۱)

۱۔ احمد بن ابی یعقوب الکاتب بن واضح الاختیاری، تاریخ الیعقوبی، جلد دوم صفحہ 123۔1964ء (النجف الاشرف: المطبعۃ الحیدریۃ)

ان واقعات میں ایک وہ واقعہ بھی ہے جو ''کنز العمال'' سے نقل کیا گیا ہے کہ خالد بن ولید نے حضرت ابوبکرؓ کو خط تحریر کیا کہ عرب کے ایک گاؤں میں ایک ایسا مرد بھی ہے کہ جو مردوں سے اسی طرح نکاح (لواطہ) کرتا ہے جیسا کہ عورت سے نکاح کیا جاتا ہے یہ خط پڑھ کر حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کچھ اصحاب کو جمع کیا ان میں حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام بھی شامل تھے۔ اس دن تمام اصحاب رسولؐ میں سے سب سے زیادہ سخت بیان حضرت علی علیہ السلام کا تھا۔ آپؑ نے فرمایا: یہ (لواطہ) وہ گناہ ہے جسے سابقہ امتوں میں سے صرف ایک امت اس گناہ کی مرتکب ہوئی ہے اور ان کے اس گناہ (بدکاری) کی وجہ سے خدا نے انہیں جس عذاب سے دوچار کیا تھا اس کا تمہیں بخوبی علم ہے۔ میری یہ رائے ہے کہ تم اس شخص کو آگ سے جلا ڈالو۔ پھر حضرت ابوبکرؓ نے خالد بن ولید کو خط میں تحریر کیا کہ اس شخص کو آگ سے جلا دو۔(۱)

اس مولف نے ایسے واقعات میں سے ایک واقعہ کتاب ''ریاض النضرۃ'' سے اس کی اسناد کے ساتھ عبداللہ ابن عمر سے نقل کیا ہے کہ یہودیوں کا ایک گروہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آیا تا کہ وہ لوگ آپ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفات کے بارے میں دریافت کر سکیں تو حضرت ابوبکرؓ نے انہیں حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام کے پاس بھیج دیا اور حضرت علی علیہ السلام نے ان یہودیوں کے تمام سوالات کے جوابات دیئے۔

اس کتاب کے مولف نے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن خطاب کے زمانہ خلافت کے ۱۹۱ ایسے واقعات تحریر کئے ہیں جن میں خلیفہ نے حضرت علی علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا یا حضرت علی علیہ السلام نے کسی مسئلہ میں اپنی رائے دینے میں خود پہل کی۔ یہ واقعات اور مسائل مختلف نوعیت کے تھے ان میں سیاست، حکومت، اقتصاد اور فکر و تشریع سے متعلقہ مسائل تھے۔

۱۔ علاء الدین علی متقی ھندی، کنز العمال حدیث نمبر 13643، پانچواں ایڈیشن 1405ھ (بیروت: موسسہ الرسالۃ)

جیسے خلیفہ ثانی نے حضرت علی علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا کہ مسلمانوں کے بیت المال سے جو مال اضافی ہو کیا اس میں خلیفہ تصرف کرسکتا ہے اور خلیفہ بیت المال سے اپنے اور اپنے اہل و عیال کیلئے کتنا مال لے سکتا ہے؟ اور کعبہ کے زیورات کو بیچنے یا تقسیم کرنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اور شراب پینے والے شخص پر حد کا تعین وغیرہ۔

حضرت امام علی علیہ السلام نے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ بیت المقدس کو فتح کرنے کیلئے خود جائیں۔ کوفہ کے مال کے تقسیم کرنے کے بارے میں خلیفہ ثانی نے حضرت علی علیہ السلام کے مشورہ پر عمل کیا۔

اسی طرح ہجری تاریخ کی ابتداء کے تعین کے بارے میں حضرت علی علیہ السلام کی رائے کو اپنایا گیا۔ اسی طرح حضرت علی علیہ السلام نے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کو تمام اصحاب کی رائے کے برعکس یہ مشورہ دیا تھا کہ خلیفہ ایرانیوں سے جنگ کرنے کیلئے خود نہ جائیں اور خلیفہ نے حضرت علی علیہ السلام کی رائے پر عمل کیا۔

مختلف مصادر سے خلیفہ ثانی عمرؓ بن خطاب کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:

''لَوْلَا عَلَیٌّ لَهَلَکَ عُمَرْ''

''اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا''

''لَا اَبْقَانِیَ اللّٰهُ لِمَعْضَلَةٍ لَیْسَ لَهَا اَبُوْالْحَسَنِ''

''اللہ مجھے کسی ایسی مشکل سے دوچار کرنے کیلئے زندہ نہ رکھے کہ جس کی مشکل کشائی کیلئے ابوالحسن (حضرت علیؑ) نہ ہو۔''

خلیفہ ثانی کے درج بالا اقوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت امام علی علیہ السلام نے خلیفہ ثانی کے دور خلافت میں کس قدر اسلامی مملکت کی مدد فرمائی۔

اس مولف نے اپنی کتاب میں دس ایسے واقعات تحریر کئے ہیں جن میں خلیفہ ثالث حضرت عثمانؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے مشورہ طلب کیا۔

اسی طرح تاریخی کتب میں حضرت امام علی علیہ السلام کی وہ نصیحتیں مذکور ہیں جو آپؑ نے اس فتنہ کے وقت خلیفہ ثالث کو کیں کہ جو فتنہ ان کے قتل کا موجب بنا۔

معاویہ بن ابی سفیان جو امام علی علیہ السلام کی شرعی حکومت کے خلاف سرکش تھا آپ نے اسے بھی اپنی قیمتی آراء سے نوازنے میں کنجوسی نہیں کی۔ بالخصوص غیر مسلموں کے اشکالات کو دور کرنے اور شرعی مسائل کے جوابات دینے میں کبھی بخل نہیں کیا۔ مولف نے اس حوالے سے ستر واقعات تحریر کئے ہیں۔

تمام آئمہ اہلبیت علیہم السلام نے اپنے زمانوں کے خلفاء سے ایسا موقف اپنایا ہے۔ بعض محققین نے آئمہ اطہار علیہم السلام کے اس موقف کو جمع کیا ہے جیسا کہ شیخ نجم الدین عسکری نے حضرت امام علی علیہ السلام کی سیرت کے متعلق خاص طور پر اپنی کتاب میں ایسے تمام موقف اور واقعات جمع کئے ہیں تا کہ حکمرانوں کے مقابلے میں آئمہ اطہارؑ کی کوششیں اور دین و امت کی مصلحت کی خدمت گزاری واضح ہو سکے۔

اپنے ساتھیوں سے حکومت کی مدد

آئمہ معصومین علیہم السلام اپنے مخلص اور قابل شاگردوں اور پیروکاروں کو اس بات پر ابھارتے کہ وہ لوگوں کے حقوق اور اسلام کی مصلحتوں کے دفاع کی خاطر حکومتی اداروں میں شامل ہوں۔ آپؑ سے جو روایات حکومتی محکموں اور اداروں میں داخل ہونے سے منع کرنے کے بارے میں ہیں وہ ظلم و جور اور تعدی سے مخصوص ہیں اور اسی طرح ان روایات میں ان کمزور عقیدوں کے مالک افراد کو روکا گیا ہے جن کے بارے میں یہ ڈر ہو کہ وہ حکومتی ماحول سے متاثر اور پگھل جائیں گے اور حکومت انہیں اپنے مقاصد میں ظلم و جور کو پھیلانے میں آلہ کار بنالے گی۔

حضر سلمان فارسیؓ کو خلیفہ ثانی حضرت عمر بن خطاب کی طرف سے مدائن کا گورنر بنایا گیا۔(۱)

۱۔ بحارالانوار۔ جلد 22 صفحہ 374

اسی طرح خلیفہ ثانی حضرت عمر کے زمانے میں حضرت عمارؓ یاسر کوفہ کے گورنر تھے۔(۱)

اسی طرح حضرت عثمانؓ نے انہیں گورنروں کے حالات دیکھنے کی خاطر تفتیش کار بنا کر مصر روانہ کیا۔(۲)

تجربہ کار فوجی جرنیل موسیٰ بن نصیر جس نے مغربی ممالک میں عظیم فتوحات حاصل کیں اور طارق بن زیاد اس کا غلام تھا جو کہ موسیٰ بن نصیر کی سربراہی میں کام کرتا تھا یہ مرد اہلبیتؑ کے خاص پیروکاروں میں سے تھا۔ اموی بادشاہ سلیمان بن عبدالملک کے دور خلافت میں اسلامی مملکت میں اس کی خاص عسکری وفوجی قدر ومنزلت اور مقام ورتبہ تھا۔(۳)

عبداللہ بن نجاشی جو کہ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے اصحاب میں سے تھے۔

عباسی بادشاہ منصور عباسی کے زمانے میں اہواز کے گورنر کے عہدے پر فائز تھے۔(۴)

علی بن یقطین کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہارون الرشید کے وزیر تھے اور ان کا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے نزدیک عظیم مقام ومرتبہ تھا۔ آپؑ نے اپنے اس منصب کو چھوڑنے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اصرار کیا کہ آپ اس منصب پر باقی رہیں اور آپؑ نے انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

''تم اس منصب کو مت چھوڑو کیونکہ ہمیں تم سے خاص محبت ہے اور تمہارے (دینی) بھائیوں کی تمہاری وجہ سے عزت ہے۔ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے وسیلے سے ظلم و جبر کو (ہمارے شیعوں سے) دور کرے یا خدا تمہارے وسیلے سے اپنے دوستوں سے مخالفین کی شر انگیزی

۱۔ تاریخ طبری۔ جلد 3 صفحہ 227

۲۔ تاریخ طبری۔ جلد 3 صفحہ 379

۳۔ الامامت والسیاست۔ جلد 2 صفحہ 75

۴۔ بزرگ طہرانی، الذریعۃ الیٰ تصانیف الشیعۃ۔ جلد 2 صفحہ 475 تیسرا ایڈیشن 1403ھ (بیروت: دارالاضواء)

کو نابود کرے۔"(۱)

اسی طرح داؤد بن زربی کے متعلق شیخ مفیدؒ نے بیان کیا ہے: داؤد بن زربی، حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے خاص اصحاب اور ثقہ افراد میں سے تھے یہ اہل علم و تقویٰ اور فقیہ تھے۔

علم الرجال کی کتابوں میں یہ مذکور ہے کہ ان کے ہارون الرشید سے خاص تعلقات تھے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس کے ان تعلقات کو باقی رکھنے کے خواہشمند تھے۔(۲)

درج بالا افراد کے علاوہ آئمہ اطہارؑ کے دیگر کئی شاگردان اور اصحاب مختلف زمانوں میں حکومتی محکموں میں مختلف عہدوں پر فائز تھے۔

آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ

لوگ آئمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت کا زیادہ تر مطالعہ ایک پہلو سے کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں دیگر پہلوؤں کو نظر انداز کر دیتے ہیں یا ان سے غافل ہوتے ہیں۔ بعض افراد ان کی سیرت کے انقلابی و جہادی پہلو کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا آئمہ اطہارؑ ہمیشہ ہر حکومت کے مخالف رہے ہیں اور ان کی ہر بات کو جھٹلاتے تھے اور آپؑ کی زندگی میں اس زمانے کی حکومت سے باہمی اچھے تعلقات کا بالکل بھی امکان موجود نہیں تھا۔

بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ گویا آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی ہمیشہ دکھوں، تکلیفوں اور مظالم میں گزری ہے اور آپؑ کی زندگی میں کبھی خوشی و مسرت کے لمحات نہیں آئے اور ایسے لوگ ہر امام کی زندگی کے صرف ان حالات کا خلاصہ بیان کرتے ہیں جو مصائب اور مشکلات سے وابستہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی میں سے علمی اور عبادتی پہلو بیان کرتے ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا ان کا سیاست اور انقلاب زمانہ سے کوئی تعلق

۱۔ باقر شریف القرشی، حیاۃ الامام موسی بن جعفر ج2 ص286 الطبعۃ الاولیٰ 1993م (بیروت دار البلاغۃ)

۲۔ الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد ج2، ص248

واسطہ نہیں ہوتا اور یہ لوگوں کو درپیش عام مسائل کا اہتمام نہیں فرماتے تھے۔

بعض افراد آئمہ معصومین علیہم السلام کی پرامن کوششوں اور سرگرمیوں میں یوں مبالغہ کرتے ہیں کہ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا یہ ہستیاں ظلم کے خلاف اٹھ کھڑا ہونے اور طاغوت کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے خلاف تھے اور یہ ظالم و جابر حکومتوں کے آگے سر تسلیم خم کر لیتے تھے اور ان کو قبول کرتے تھے۔ اس قسم کے انفرادی پہلوؤں کا مطالعہ کرنے سے آئمہ معصومین علیہم السلام کی حیات طیبہ کے تمام گوشوں کی تصویر کشی نہیں ہوتی ہے اس قسم کے تجزیئے کرنے سے آپؑ کی زندگی کے دیگر پہلوؤں کو حقیقی صورت میں نہیں دیکھا جا سکتا۔

آئمہ معصومین علیہم السلام اور ان کی اپنے زمانے کی حکومتوں کے ساتھ مثبت تعلقات بیان کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام ان حکومتوں کے برے کارناموں سے لاعلم ہوتے تھے اور نہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حکمرانوں کی طرف سے آئمہؑ پر ظلم و تعدی اور سختیوں کی وجہ سے یہ ہمیشہ حکمرانوں کے ہر کام پر اعتراض اور مخالفت پر اتر آتے تھے۔

اس موضوع کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہے کہ آئمہ معصومین علیہم السلام کی زندگی کے ہر پہلو کا مطالعہ کیا جائے اور آپؑ کی سیرت طیبہ کا کوئی رخ ایسا نہ ہو جس سے انسان جاہل و لاعلم ہو یا اس کو فضول و عبث سمجھ کر نظر انداز کر دے۔ آپؑ کی سیرت کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنے سے نئی نسل کو اپنی سوچ کے ارتقاء اور اجتماعی سیاسی معاملات کو بہتر کرنے میں مدد ملے گی۔

آئمہ اہلبیتؑ کا مختلف حکومتوں کے ساتھ مختلف طرح کا طرز عمل کا سبب اس زمانے کے حالات و واقعات تھے۔ پس ہر زمانے کے حالات کا اپنا خاص تقاضا ہوتا تھا کہ ان حالات میں دین اور امت کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیسے دین اور امت کو فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ آپؑ کبھی بھی اپنے شخصی یا گروہی مفادات کو مدنظر نہیں رکھتے تھے بلکہ آپؑ کی اقدار مستحکم اور مستقیم ہیں۔ آپؑ عوام کی مصلحت اور انسانی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے سیاسی میدان میں اپنا موقف اور رویہ اپناتے تھے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا منہاج اور اخلاق

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا منہاج اور اخلاق

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام آئمہ اہلبیتؑ میں سے ساتویں امام ہیں۔آپ کی ولادت باسعادت اموی حکومت وسلطنت کے آخری سالوں کے دوران 128 ہجری میں ہوئی ۔جبکہ 132 ہجری میں عباسیوں کے ہاتھوں اموی حکومت کا خاتمہ ہوا۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی شہادت 25 رجب 183 ہجری میں ہوئی اس وقت آپؑ کی عمر مبارک پچپن (55) برس تھی۔

آپؑ نے اپنے والد گرامی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے زیر سایہ تربیت اور پرورش پائی اس وقت اموی سلطنت کمزور ہورہی تھی اور عباسی سلطنت قائم ہورہی تھی لہٰذا ان حالات میں حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو ایک بڑی علمی تحریک اور مدرسہ قائم کرنے کا موقع میسر آیا اور آپ نے مختلف تخصصات (Specialiations) میں لوگوں کی علمی صلاحیتوں کے ساتھ تربیت کی ۔ یہاں تک کہ آپؑ کے شاگرد اور آپ سے روایت کرنیوالوں کی تعداد چار ہزار افراد تک پہنچ گئی جیسا کہ کئی مورخین نے یہ ذکر کیا ہے۔

ابن حجر نے بیان کیا ہے: حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے ایسے علوم نقل کئے ہیں جن کے متعلق گفتگو کرنا جان جوکھوں کا کام ہے اور آپ کے علوم وکمالات کی شہرت تمام شہروں میں پھیلی ہوئی تھی۔آپ سے بڑے بڑے اماموں نے روایت کی ہے جیسا کہ یحییٰ بن سعید، ابن جریج، سفیانین (دو سفیان یعنی ابو محمد سفیان بن عیینہ حلالی اور ابو عبداللہ سفیان بن سعید ثوری، از

مترجم) ابوحنیفہ، شعبہ اور ایوب سختیانی۔(۱)

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اپنے والد حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے ہمراہ اس علمی ماحول میں بیس سال گزارے۔148 ہجری میں امام جعفر صادق علیہ السلام کی شہادت ہوئی تو نبوت کے گھرانے کی سرداری اور منصب امامت آپ کے سپرد کر دیا گیا۔آپ نے پینتیس (35) سال تک امامت کی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کی امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو وہ حالات اور ماحول نہ ملا جیسا کہ آپؑ کے والد گرامی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کو میسر تھا۔ بلکہ آپ نے عباسی حکمرانوں کی جانب سے بہت سی مشکلات، سختیاں اور دباؤ کا سامنا کیا لیکن حالات کے مطابق آپ نے آخری حد تک اپنی علمی اور دینی ذمہ داریوں کو ادا کیا۔مورخین نے ذکر کیا ہے کہ آپ کے شاگردوں اور آپ سے روایت نقل کرنے والے افراد کی تعداد تین سو انیس (319) ہے ان تمام افراد کے نام اور حالات زندگی معروف (عراقی) محقق اور ریسرچر باقر شریف قرشی نے اپنی کتاب ''حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ ''میں بیان کئے ہیں۔(۲)

کاظم (غصے پر قابو پانے والا):

دیگر آئمہ معصومین علیہم السلام کی طرح حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام میں وہ تمام صفات موجود تھیں جو فضیلت اور کمالات پر دلالت کرتی ہیں کیونکہ آپؑ اہلبیت علیہم السلام میں سے ہیں جن سے اللہ نے رجس اور گندگی کو دور رکھا ہے اور انہیں حقیقی معنوں میں پاک و طاہر رکھا ہے۔ آپؑ کے ہم عصر لوگوں اور علماء و مورخین میں سے جس نے آپؑ کی سیرت طیبہ کا مطالعہ کیا ہے۔اس نے یہ بیان کیا ہے کہ آپؑ کی شخصیت میں بلند و بالا اوصاف، اعلیٰ اخلاقی اقدار کوٹ

۱۔ الصواعق المحرقہ جلد 2 صفحہ 586

۲۔ حیاۃ الامام موسیٰؑ بن جعفرؑ جلد 2 صفحہ 374-225

کوٹ کر بھری ہوئی تھیں اور آپؑ کے مکارم اخلاق میں سے بعض کو آپؑ کا لقب قرار دیا گیا اور وہ صفت آپؑ کے نام کے ساتھ استعمال ہونے لگی۔

ابن جوزی نے آپؑ کی صفات کا تذکرہ کرتے ہوئے بیان کیا ہے: ''حضرت موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کو عبد صالح کے لقب سے پکارا جاتا، آپؑ حلیم اور کریم تھے۔ جب آپؑ کو کسی شخص کے بارے میں خبر ملتی کہ اس نے آپؑ کی برائی کی ہے اور آپؑ کو اذیت دی ہے تو آپؑ اس کے پاس مال بھیج کر حسن سلوک کا مظاہرہ کرتے''(۱)

آپؑ کے القابات میں سے سب سے مشہور لقب ''کاظم'' ہے ابن حجر الھیثمی بیان کرتا ہے: ''موسیٰ کاظمؑ، یہ وہ ہستی ہیں جو علم و معرفت، کمال اور فضائل میں حضرت جعفر صادق علیہ السلام کے وارث ہیں آپؑ کو کاظمؑ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ آپؑ اپنے دشمنوں سے بہت زیادہ درگزر کرتے اور بردبار تھے۔ آپؑ عراق کے لوگوں کے نزدیک خدا کی بارگاہ میں سب سے زیادہ عبادت گزار، سب سے بڑے عالم اور سب سے زیادہ سخی تھے۔(۲)

ابن اثیر بیان کرتا ہے: آپؑ کو اپنے صبر، اعلیٰ اخلاق اور برائی کے بدلے میں نیکی و احسان کرنے کی وجہ سے ''کاظم'' کے لقب سے شہرت ہوئی۔(۳)

کظم الغیظ:

کظم الغیظ (غصے پر قابو پانا) ایک اہم اخلاقی صفت ہے جس کے متعلق قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے:

''وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ''

(سورہ آل عمران آیت 134)

۱۔ عبدالوہاب انصاری شعرانی۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ صفحہ 178، 1967ء (مکہ: مطبعہ النھضۃ الحدیثہ)

۲۔ الصواعق المحرقہ جلد 2 صفحہ 590

۳۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفر جلد 1 صفحہ 50

ترجمہ: ''(متقی وہ ہیں) جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

''اَلْکَظْمُ'' لغوی اعتبار سے مصدر ہے، عربوں کا قول ہے کہ کَظَمَ یَکْظِمُ، اس کا مطلب ہے رکنا اور کسی چیز کو جمع کرنا۔ اسی سے ''اَیْکَظْمُ لِلْغَیْظِ'' ہے۔ یعنی غصے کو پی جانا اور اس کو ظاہر کرنے سے رکنا، گویا کاظم اپنے دل میں غصے کو جمع کرتا ہے اور اس کا اظہار نہیں کرتا بلکہ اسے دل میں ہی پی جاتا ہے۔

''الغیظ'' لغوی اعتبار سے مصدر ہے، عربوں کا قول ہے'' غَاظَهٗ یَغِیْظُهٗ'' یعنی غصہ دلانا، غصہ پر آمادہ کرنا۔ ''لسان العرب'' میں مذکور ہے کہ غیظ، غضب و غصے سے زیادہ سخت ہوتا ہے، ایک قول کے مطابق غیظ، غضب و غصے کے جوش اور ابال کو کہتے ہیں۔

اصطلاحی اعتبار سے طبری نے اپنی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ ''اَلْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ'' کا مطلب ہے کہ ''جب نفس غصے سے بھر جائے تو اس غصے کو پی جانا'' کہا جاتا ہے کہ ''کَظَمَ فُلَانٌ غَیْظَهٗ'' یعنی فلاں شخص اپنا غصہ پی گیا، یہ تب کہا جاتا ہے اگر کسی شخص کو غصہ دلایا جائے اور وہ اپنے غصے پر قابو رکھے اور جس نے اس پر ظلم کیا ہو وہ اس سے بدلہ لے سکتا ہو لیکن پھر بھی اپنے نفس کی حفاظت کرتے ہوئے غصہ پی جائے۔

جب انسان کے ساتھ کوئی برائی کی جائے جس سے وہ بے قرار و مضطرب ہوتا ہو یا اس کیساتھ کوئی ایسا کام ہو جس سے اسے کوئی اذیت و تکلیف پہنچے تو وہ نفسیاتی طور پر متاثر ہوتا ہے اور اس کا دل رنج و الم اور غضب و غصے سے بھر جاتا ہے لیکن اگر وہ اپنی نفسیاتی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے اپنے احساسات کو چھپا لے اور کوئی انتقامی ردعمل ظاہر نہ کرے بلکہ اس کا غضب و غصہ اس کے چہرے یا زبان کے الفاظ سے بھی ظاہر نہ ہو تو اس کا اپنے ارادے اور اعصاب پر کنٹرول اور تسلط کو ''کِظْمُ الْغَیْظِ'' کہتے ہیں۔

انسان اس وقت اس بلند اخلاقی درجہ پر فائز ہوتا ہے جب یہ پہلے سے تقویٰ و پرہیز گاری

اور نفس کی تربیت وتہذیب کے مرحلے سے گزر چکا ہو۔انسان کی ابتدائی طبیعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ مختلف اثرات اور انفعالات کا جواب دے، یہ سوچ اسے انتقام لینے کیلئے ابھارتی ہے اور یہ سب غصہ اور بیرونی امور کے اثر انداز ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے۔

اسی وجہ سے غصہ پر قابو پانے والا شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے بہت زیادہ اجر وثواب پاتا ہے۔جیسا کہ ابن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حدیث نقل کی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

''مَنْ كَظَمَ غَيْظَهُ وَلَو شَاءَ اَنَ يَمْضِيَهُ اَمْضَاهُ ، مَلاَ اللّٰهُ قَلْبَهُ رَجَاءً يَوْمَ الْقِيَامَةِ''

''اگر کوئی شخص غصہ کی حالت میں اس کا اظہار کر سکنے کے باوجود اسے پی جائے تو اللہ قیامت کے دن ایسے شخص کے دل کو (اپنی رحمت کی) امید سے بھر دے گا۔''

ایک اور حدیث میں ابن عمر نے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

''مَا مِنْ جُرْعَةٍ اَعْظَمُ اَجْراً عِنْدَا للّٰهِ مِنْ جُرْعَةِ غَيْظٍ كَظَمَهَا عَبْدًا اَبْتِغَاءَ وَجِهِ اللّٰهِ''(۱)

''اللہ کے نزدیک اجر وثواب کے اعتبار سے زیادہ عظمت والا گھونٹ وہ غصے کا گھونٹ ہے جسے صرف اللہ کی خوشنودی کیلئے انسان پی جائے۔''

بے شک غصہ پر کنٹرول اور قابو ہونا اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ شخص مضبوط قوت ارادی کا مالک اور اپنے نفس پر قابو پانے کی طاقت رکھتا ہے جبکہ اپنے نفس پر قابو پانے کی قوت وطاقت، جسمانی پٹھوں کی قوت وطاقت سے زیادہ اہم ہوتی ہے۔درج ذیل حدیث جو انس سے منقول ہے اس معنی کی تاکید کرتی ہے کہ حضرت انس سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

۱۔ مسند احمد بن حنبل، حدیث نمبر 6116

کچھ لوگوں کے پاس سے گزرے جو کشتی کر رہے تھے تو آپؐ نے فرمایا: کیا ہو رہا ہے؟ انہوں نے کہا: فلاں آدمی جس سے بھی کشتی کرتا ہے اسے پچھاڑ (گرا) دیتا ہے، یہ سن کر آپؐ نے فرمایا: میں تمہیں اس سے زیادہ طاقت ور آدمی نہ بتاؤں، یہ وہ آدمی ہے جس سے کسی آدمی نے (غصہ دلانے والی) بات کی تو وہ اپنے غصے کو پی گیا، پس ایسا شخص اس پر غالب آ گیا، اپنے شیطان پر غالب آ گیا اور اپنے ساتھی کے شیطان پر غالب آ گیا۔(۱)

کمزور انسان جو ردعمل دکھانے کی قوت و طاقت ہی نہ رکھتا ہو یا بزدل شخص جو مدمقابل کا مقابلہ کرنے کیلئے شجاعت کا مالک نہ ہو تو اس کا چپ ہو جانا غصے کو پی جانا نہیں ہوتا بلکہ جو شخص طاقتور اور بہادر ہو اور وہ جوابی وار کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو لیکن طاقت کے باوجود کچھ نہ کرے بلکہ چپ رہے تو یہ غصے کو پی جانا اور اس پر قابو پانا کہلاتا ہے اوپر مذکور حدیث میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ''غصہ کا اظہار کر سکنے کے باوجود اسے پی لیا جائے''

اگر ایسے شخص کے ساتھ برائی کی جائے اور اس کا حق پامال ہو اسے تکلیف دی جائے جس سے وہ مضطرب اور پریشان ہو اور وہ مقابلہ کرنے کیلئے شجاعت و بہادری کے باوجود کسی بلند ہدف اور اہم مصلحت کی خاطر اپنے غضب کو ٹھنڈا کر دے اور غصے پر قابو رکھتے ہوئے اسے پی جائے تو اس عظیم صفت کو (عربی میں) کِظْمُ الْغَیْظِ کہتے ہیں اور جو اس عظیم صفت کا مالک ہو اسے ''کاظم'' کہتے ہیں۔ ایسا شخص خدا کی طرف سے عظیم اجر و ثواب کا مستحق اور بلند قدر و منزلت کا حقدار ہوتا ہے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا اخلاق

حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہ السلام کی سیرت اور حیات طیبہ میں یہ عظیم صفت (غصہ پر قابو

۲۔ احمد بن علی بن حجر، عسقانی، فتح الباری فی شرح صحیح البخاری حدیث نمبر 6116، پہلا ایڈیشن 1418ھ (ریاض: مکتبۃ دارالسلام)

پانا) اس قدر راسخ تھی کہ یہ صفت آپؑ کے نام کے ساتھ آپؑ کا لقب ''کاظم'' قرار پایا۔ مورخین نے ایسے کئی واقعات بیان کئے ہیں جن میں حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے دوسروں کے ساتھ اپنے ذاتی معاملات میں غصہ پر قابو پانے کی اعلیٰ مثالیں قائم کی ہیں۔ آپؑ کے اس طرز عمل کی وجہ سے آپؑ کے ساتھ برائی کرنیوالے اکثر لوگ آپؑ کے حبدار بن جاتے تھے۔

تاریخ دانوں نے یہ بیان کیا ہے کہ (حضرت عمر کی نسل سے) ایک شخص اکثر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ برائی سے پیش آتا اور آپؑ کے جد بزرگوار امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام پر سب وشتم کرتا تھا۔ امام کے بعض شیعوں نے اسے قتل کرنے کا ارادہ کیا تو آپؑ نے ان کو ایسا کرنے سے منع فرمایا اور قتل کئے بغیر اس کا حل تلاش کرنے کا مشورہ دیا۔ آپؑ نے اس کے رہنے کی جگہ معلوم کی تو آپؑ کو بتایا گیا کہ مدینہ کے اطراف میں اس کا کھیت ہے۔ امام اپنی سواری پر بیٹھ کر اس کے کھیت میں پہنچ گئے تو اس کو وہیں پر موجود پایا۔ جب آپؑ اس کے نزدیک پہنچے تو اس عمری نے آپؑ کو پہچان لیا اور آگ بگولہ ہوگیا کیونکہ امامؑ کے گدھے نے اس کی زراعت کو نقصان پہنچادیا تھا، امامؑ نے اس سے نرمی سے گفتگو کرنا شروع کی اور اس سے فرمایا: ''تمہارا اس میں کتنا نقصان ہوا ہے؟''

اس نے کہا: سو دینار، تو آپؑ نے فرمایا: تم اس سے کتنے منافع کی امید رکھتے تھے؟ اس نے کہا: میں علم غیب نہیں رکھتا یعنی نہیں جانتا۔

امامؑ نے فرمایا: میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ تجھے اس سے کتنے منافع کی امید تھی؟ اس نے کہا: تقریباً دوسو دینار

امامؑ نے اس کو تین سو دینار دیتے ہوئے فرمایا: یہ تمہارے لئے ہیں اور تمہارا کھیت بھی اپنے حال میں موجود ہے۔(۱)

۱۔ حیاۃ الامام موسیٰؑ بن جعفرؑ ج 1 ص 156

اس واقعہ کے بعد اس شخص کا امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے سلوک اور برتاؤ تبدیل ہوگیا کیونکہ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے پاس امامؑ کے خلاف کینہ وبغض اور برے سلوک کی کوئی وجہ باقی نہیں ہے اس کے بعد اس کی جب بھی امامؑ سے ملاقات ہوئی تو وہ انتہائی ادب واحترام کے ساتھ آپؑ سے ملا۔

عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی طرف سے 179 ہجری میں آپؑ کو پہلی دفعہ گرفتار کر کے مدینہ منورہ سے بصرہ لا کر ایک قید خانے میں بند کر دیا گیا اس قید خانے کا نگران عیسیٰ بن ابی جعفر تھا وہ حکومت کے احکامات اور اپنی ذمہ داری کے تحت امامؑ پر قید خانے میں سختیاں کرتا رہا لیکن امام موسیٰ کاظم علیہ السلام اس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک سے پیش آتے اس نے ایک سال تک امامؑ کی سیرت و کردار کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپؑ کی سچی گفتگو کو ملاحظہ کیا پھر اس کی آپؑ کے متعلق رائے تبدیل ہوگئی اور وہ امامؑ کے ساتھ احترام سے پیش آتا۔ بالآخر عیسیٰ بن ابی جعفر نے خلیفہ ہارون الرشید سے امامؑ کو قتل کرنے یا مزید قید خانہ میں رکھنے سے معذرت کر لی اور درج ذیل خط ہارون الرشید کو تحریر کیا:

''امیر المومنین! آپ نے مجھے اس شخص (حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام) کے بارے میں تحریر کیا ہے حالانکہ میں نے کافی عرصہ تک اس شخص کا امتحان لیا ہے اور اس مقصد کی خاطر ایک مرد کو اس کے ساتھ قید خانے میں ڈال دیا جو دراصل اس پر میرا جاسوس تھا۔ میں نے اس دوران اس شخص سے کبھی کوئی برا عمل سرزد ہوتے نہیں دیکھا اور اس نے ہمیشہ امیر المومنین (ہارون الرشید) کو بھلائی سے یاد کیا ہے اور کبھی امیر المومنین کیلئے بد دعا نہیں کی اور نہ کبھی کسی اور کیلئے بد دعا کی ہے۔ بلکہ یہ شخص آپ اور تمام مسلمانوں کی مغفرت وبخشش اور رحمت کی دعا مانگتے ہیں۔ ہر وقت انہیں روزہ، نماز اور عبادت میں مشغول پایا ہے۔ اگر امیر المومنین مناسب سمجھیں تو مجھے ان کے حوالے سے بری الذمہ قرار دیں میں ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا یا انہیں کسی اور کے حوالے کر دیا جائے ورنہ میں انہیں رہا کر دوں گا۔ مجھے

ان کے بارے کافی پریشانی لاحق ہے''۔(۱)

ایسا کئی دفعہ ہوا کہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کو قید خانے میں قید کیا جاتا آپؑ کی نگرانی پر مامور حکومتی کارندہ آپؑ کا چاہنے والا بن جاتا تھا۔ آپؑ کو سب سے آخر میں بغداد میں سندی بن شاہک کے قید خانے میں ڈالا گیا جو آپؑ کو بہت زیادہ اذیت وتکلیف دیتا تھا۔ لیکن آپؑ ان اذیت دینے والوں سے بھی حسن سلوک سے پیش آتے تھے ان اذیت دینے والوں میں سے ایک کا نام بشار تھا جو اس قید خانے کے انچارج سندی بن شاہک کا غلام تھا۔ بشار ان لوگوں میں سے ایک تھا جسے آلِ ابوطالبؑ سے سخت بغض اور کینہ تھا وہ امامؑ کو بہت زیادہ اذیت دیا کرتا تھا لیکن امامؑ اس کے برے سلوک کو برداشت کرتے اور بدلے میں ایک سخت لفظ یا بری نظر بھی نہیں ڈالتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد بشار کی سوچ اور شخصیت تبدیل ہوگئی اور وہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جبداروں اور موالیوں میں سے بن گیا۔(۲)

اسی طرح امام اپنے غصے پر قابو رکھتے اور آپؑ اپنے ساتھ برائی سے پیش آنے والوں سے بھی اچھائی سے پیش آتے تھے۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا منہاج

میرے نزدیک حضرت امام موسیٰ بن جعفر علیہم السلام کا لقب ''کاظمؑ'' قرار پانے کی سب سے اہم وجہ اور اس کی دقیق ترین تفسیر اس منہج میں پنہاں ہے جو امامؑ کی سیرت سے وابستہ ہے اور آپؑ کے دور امامت میں جو سیاسی حالات تھے آپؑ نے ان حالات میں جیسا طرزِ عمل اپنایا ہے اس وجہ سے آپؑ کو ''کاظمؑ'' کہا جاتا ہے ۔

آئمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے امامت کی ذمہ داریاں انتہائی مشکل، حساس اور نازک

۱۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ ج2، ص467

۲۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ ج2، ص487

حالات میں آپؑ (امام موسیٰ کاظمؑ) کے کاندھوں پر آئیں۔اس وقت حکومت عباسیوں کے ہاتھ میں تھی اور وہ دور بنوعباس کے سیاسی اور اقتصادی عروج کا زمانہ تھا۔جیسا کہ یہ بات مشہور ہے کہ ایک دفعہ ہارون الرشید نے آسمان پر بادل کو گزرتے ہوئے دیکھا تو اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا:

''اے بادل! جہاں تیرا جی چاہتا ہے جا کر برس لیکن یاد رکھو تم سے اگنے والے اناج کا خراج میرے پاس ہی آئے گا''

اس وقت بنوعباس کا دارالخلافہ ''بغداد'' کو اس کے مال وثروت محلات اور باغوں کی وجہ سے ''عروس الدنیا'' کہتے تھے۔ابن خلدون نے ''مقدمہ ابن خلدون'' میں بیان کیا ہے کہ ہارون الرشید خلافت کے زمانے میں ہر سال 7500 قنطار وزن کے برابر خراج بیت المال پہنچتا تھا۔سب شہروں میں ان کی حکومت کا سکہ چلتا تھا اور سب لوگ ان کے مطیع وفرمانبردار تھے۔

دوسری جانب عباسی حکومت اور علویوں (اولاد علیؑ) کے درمیان تعلقات کشیدہ تھے کیونکہ اموی حکومت کے خلاف انقلاب برپا کرنے والوں میں،عباسیوں کے ساتھ علوی بھی شریک تھے بلکہ بنوعباس نے آلِ محمد علیہم السلام کے نام کے نعرے بلند کئے اور آل محمد علیہم السلام کے نام پر لوگوں کو اس تحریک میں شامل ہونے کی دعوت دی تھی۔''ابوا'' کے مقام پر ہونے والی کانفرنس کے مطابق حکومت سنبھالنے کے امیدوار علوی تھے۔اس کانفرنس میں علویوں میں سے ہاشمی سردار اور عباسی سردار جمع ہوئے تھے اور وہ اس کانفرنس میں اموی حکومت کا تختہ الٹنے اور لوگوں کو اپنی طرف بلانے کیلئے تحریک شروع کرنے کے امور زیر بحث لائے اور وہ سب لوگ (ابواء کانفرنس کے شرکاء) محمد بن عبداللہ بن حسن (مثنیٰ) کی بیعت کرنے پر متفق ہوئے۔اس کانفرنس میں جن لوگوں نے محمد بن عبداللہ بن حسن مثنیٰ کی بیعت کی تھی ان میں ابوالعباس سفاح(۱) اور ابوجعفر منصور دوانیقی بھی شامل تھے جنہوں نے بعد میں زمام حکومت سنبھالی۔حکومت مل جانے کے بعد عباسیوں نے علویوں

۱۔ یہ پہلا عباسی خلیفہ تھا اور اس کا پورا نام عبداللہ بن محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس ہے۔مترجم

سے تجاوز کرتے ہوئے انہیں نظر انداز کیا اور خود ہی تنہا حکومت کرنے لگے۔

اس وعدہ خلافی اور بیعت شکنی پر علویوں کے درمیان غضب وغصہ کی فضاء پیدا ہوگئی جو کہ بنو عباس بخوبی جان چکے تھے اس لئے وہ علویوں سے محتاط رہتے کیونکہ انہیں علویوں کی طرف سے مخالفانہ ردعمل کی توقع تھی۔ علویوں کی طرف سے بنوعباس کی حکومت کے خلاف شورش برپا کرنے سے بچنے کیلئے عباسیوں نے ان پر سختیاں شروع کردیں اور اپنے مخالفین اور بچا زاد اولاد علیؑ پر دباؤ بڑھادیا جس سے علویوں کو اموی حکم کے ظلم وستم یاد آنے لگے بلکہ بعض اوقات عباسی حکومت ظلم وستم اور سختیوں میں اموی حکومت سے بھی دو قدم آگے نکل جاتی۔ اسی وجہ سے ایک شاعر نے کہا ہے:

تَاللّٰهِ مَا فَعَلَتْ اُمَيَّةَ فِيهِمْ مِعْشَارَ مَا فَعَلَتْ بَنُوْ الْعَبَاسِ

خدا کی قسم بنوامیہ نے آل محمد علیہم السلام پر جو مظالم ڈھائے ہیں وہ بنوعباس کے آل محمد علیہم السلام پر مظالم کے دسویں حصہ کے برابر بھی نہیں ہیں۔

بنوعباس کے اولادِ علیؑ پر ظلم وستم اور سختیوں کی وجہ سے علویوں کی طرف سے کئی انقلابی تحریکوں نے سر اٹھایا جیسے منصور دوانیقی کے دور حکومت میں محمد بن عبداللہ بن حسن (مثنیٰ) اور ان کے بھائی ابراہیم کی انقلابی تحریکیں، موسیٰ ہادی عباسی کے دورِ حکومت میں حسین بن علی بن حسن المعروف شہید رفخ کی قیادت میں انقلابی تحریکیں۔

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام علویوں کی کسی انقلابی تحریک میں شریک نہیں ہوئے لیکن اس کے باوجود عباسی حکومت آپؑ کی روحانی و دینی شخصیت اور عظیم قدر و منزلت کی وجہ سے آپ کے وجود سے پریشان رہتی تھی۔ آپؑ کی یہ عظیم قدر ومنزلت صرف علویوں کے نزدیک نہیں تھی بلکہ پوری امت آپ کی تعظیم وتکریم کرتی تھی۔

اہل بیت علیہم السلام کا راستہ، ترقی اور آگے بڑھنا

جب امت مسلمہ نے اموری دورِ حکومت میں ظلم وستم سہتے ہوئے زندگی گزار لی اور ان پر

بنوعباس کے حکمرانوں کی نیت آشکار ہوگئی کہ وہ صرف حکومت وسلطنت کے طلبگار ہیں ان کے نزدیک رسالتؐ کے پیغام کی کوئی اہمیت نہیں ہے تو لوگوں کی نظریں آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی طرف مرکوز ہوگئیں کیونکہ لوگوں کے مطابق امت مسلمہ کو درست سمت میں گامزن کرنے کیلئے اور انہیں ہلاکت سے بچانے کیلئے صرف آئمہ اہلبیت علیہم السلام آخری امید تھے۔جس وقت بنوعباس والے بنوامیہ کے ساتھ جنگ وجدل میں مصروف تھے اس وقت حضرت امام محمد باقر علیہ السلام اور حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی قیادت میں وسیع پیمانے پر ثقافتی وفکری انقلاب اور علمی تحریک کی بدولت ایسے مفاہیم ومعارف پھیل رہے تھے جن کی تعمیر وترقی اہلبیتؑ کے مکتب اور مدرسہ کے مرہون منت تھی۔جو کہ اسلام کے صحیح اصولوں اور اصل علمی قوانین ومناہج کی نمائندگی کررہے تھے اور یہ اصول وقوانین قرآن مجید اور سنت سے اخذ کئے گئے تھے جو کہ ذاتی خواہشات اور سیاسی و مصلحتی اثر ورسوخ سے پاک تھے۔اسی طرح آئمہ اہلبیت علیہم السلام کی شخصیات میں دیگر حکمرانوں اور افراد سے واضح فرق ان کا علم وتقویٰ اور اخلاق تھا جس کی وجہ سے لوگوں کے دل آپؑ کی طرف جھک جاتے تھے۔ان تمام اسباب کے باوجود اہلبیتؑ کا راستہ ترقی اور آگے بڑھنے کا راستہ تھا۔خاص طور پر حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے زمانے میں اہلبیتؑ کے بعض حبدار اور چاہنے والے موالی اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے حکومتی نظام میں حساس مناصب تک پہنچ گئے اور حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے اس کیلئے ان کی حوصلہ افزائی فرمائی کہ وہ حکومت کے حالات اور حکمرانوں کے ماحول کو صرف اس لئے برداشت کریں کہ وہ ہر ممکن کوشش کے ذریعے عوام کی بہتری کیلئے اپنا کردار ادا کریں اور جس قدر ممکن ہوسکے وہ حکومتی فیصلوں میں بہتری لائیں اور معاشرے کے کمزور افراد اور مومنین کے مددگار بنیں۔

مثلاً علی بن یقطین، مہدی عباسی کے دور خلافت میں وزیر قانون تھے اور وہ ہارون الرشید کے زمانے میں بھی وزارت عظمیٰ کے منصب پر موجود رہے، بعض روایات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ایران کے اہم علاقہ ''ری'' (موجودہ تہران اور شاہ عبدالعظیم) کا گورنر بھی

اہلبیتؑ کے پیروکاروں میں سے ایک شخص تھا۔ اس وقت اہلبیتؑ کے مکتب کی ترقی اور نشر واشاعت کی بڑی مثال یہ بھی ہے کہ مختلف شہروں سے زکوٰۃ وخمس کی مد میں بہت زیادہ رقم اور مال امامؑ کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا۔ یونس بن عبدالرحمٰن کہتا ہے کہ جب حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام دنیا سے رخصت ہوئے تو آپؑ کے ہر نمائندے (وکیل) کے پاس بہت زیادہ مال (مال امامؑ) موجود تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اس مال کے لالچ میں آپؑ کی موت کا انکار کر دیا۔ زیاد بن مروان قندی کے پاس ستر ہزار دینار اور علی بن ابی حمزہ کے پاس تیس ہزار دینار تھے۔(۱)

اس وقت اہلبیتؑ کی تعلیمات پر مشتمل دین اسلام صرف حجاز اور عراق میں ہی موجود نہ تھا بلکہ یہ ایران، مصر، مغرب (مراکش وغیرہ) اور دیگر ممالک تک پھیلا ہوا تھا۔

ایک شخص نے ہارون الرشید کو امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے خلاف ابھارتے ہوئے کہا: اس وقت زمین پر دو خلیفہ ہیں، میں نے تمہارے علاوہ موسیٰؑ بن جعفرؑ کو بھی خلافت کے امور سر انجام دیتے ہوئے دیکھا ہے۔

مشرق ومغرب (ہر جگہ سے) اموال اس کے پاس لایا جاتا ہے۔(۲)

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پر حکومتی سختیوں میں شدت

حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام پر تمام آئمہ اہلبیت علیہم السلام سے زیادہ سخت دباؤ کا سامنا تھا۔ آپؑ کو مختلف عرصے کیلئے پانچ دفعہ زندان میں ڈالا گیا۔

آپؑ کی اسیری کی کل مدت سات برس ہے۔ بعد اوقات آپؑ کو گھر میں جبری نظر بند کیا جاتا رہا۔ بعض قید خانوں میں آپؑ کو سخت اذیت اور تکلیف سے دوچار کیا جاتا رہا۔ تنگ وتاریک قید خانے میں ڈال دیا جاتا اور انتہائی متعصب ودشمن اہلبیتؑ سپاہیوں کو آپؑ پر مسلط کیا جاتا جو آپؑ پر مختلف

۱۔ بحارالانوار، ج48، ص252

۲۔ حیاۃ الامام موسیٰؑ بن جعفرؑ، ج2، ص455

طرح ظلم وستم روا رکھتے۔اسی طرح جب آپؑ قید خانے سے باہر ہوتے تو آپؑ کی سخت نگرانی کی جاتی تھی اور حکومت کی طرف سے آپؑ کے خاندان کے افراد میں سے اولادِ علیؑ پر ظلم ڈھا کر انہیں علاقہ بدر ہونے پر مجبور کر کے اور سخت سزاؤں سے دوچار کر کے آپؑ پر شدید نفسیاتی دباؤ ڈالا جاتا رہا۔

یہ تمام دباؤ آپؑ کو اس بات کی دعوت دیتے تھے کہ امامؑ اعلانیہ طور پر عباسی حکومت کے مقابلے پر آجائیں اور اپنی جان کے دفاع وحریت اور اپنے خاندان کے افراد اولادِ علیؑ اور اپنے پیروکاروں اور موالیوں کی مشکلات اور مصائب کو دور کرنے کیلئے تحریک شروع کریں۔

امامؑ کے اندر ہرگز شجاعت و بہادری ور جرات کی کمی نہ تھی اور نہ آپؑ نے کبھی اپنے ماننے والوں کی قلیل تعداد کا شکوہ کیا تھا بلکہ آپؑ غصے اور غضب پر قابو رکھتے تھے۔آپؑ حکومت کی سختیوں کا اس لئے خاموشی سے مقابلہ کرتے رہے تا کہ حکومت کو آپؑ کے ماننے والوں اور تعلیمات اہلبیتؑ کے پیروکاروں کے خلاف جنگ مسلط کرنے کا بہانہ نہ ملے اور حالات پہلے سے زیادہ بدتر نہ ہو جائیں کہ جسکی وجہ سے تشیع کی نشو ونما، ترقی اور نشر واشاعت کے آگے بند باندھ دیا جائے۔امامؑ کو بالکل بھی حکومت وسلطنت کے حصول کا طمع اور لالچ نہ تھی بلکہ آپؑ رسولؐ کے جانشین ہونے کی حیثیت سے رسالتؐ اور امت مسلمہ کی مصلحت اور مفادات کے متعلق سوچتے تھے اور اس مقصد کی خاطر رنج والم اور مشکلات کو برداشت کرتے اور غصے پر قابو رکھتے۔آپؑ ظلم وستم کے ردعمل اور انتقام لینے کی خاطر مصلحت عامہ کو ہرگز قربان نہیں کر سکتے تھے۔یہاں پر واضح ہوتا ہے کہ آپؑ نے غصے پر قابو پانے کو ایک منہج، سیاسی دعوت اور متحرک منصوبہ کے طور پر اپنایا تا کہ اہلبیت علیہم السلام کا راستہ اور تعلیمات، اسلام کو سمجھنے کیلئے اصلی مدرسہ (School of Thought) کے طور پر باقی رہے امت کی زندگی میں تہذیبی و ثقافتی نظریہ قائم رہے جو دباؤ اور مشکلات کو عبور کرتے ہوئے اسلام اور دنیا جہان کے روشن مستقبل کی نوید وخوشخبری سناتا ہے۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام اور وسعت قلبی کا ثمرہ

حضرت امام علی رضا علیہ السلام اور وسعت قلبی کا ثمرہ

عباسی خلیفہ مامون کی طرف سے 201ہجری میں حضرت امام علی رضا علیہ السلام (148ھ۔۔203ھ) کو ولی عہد قرار دے کر لوگوں سے ان کی بیعت لینا آئمہ اہلبیت علیہم السلام اور ان کے زمانے کے حکمرانوں کے درمیان تعلقات کی تاریخ کا ایک منفرد اور اہم واقعہ ہے، اس سے پہلے اموی اور عباسی حکومتوں کی طرف سے ہمیشہ اہلبیت علیہم السلام پر ظلم و ستم کرنے اور ان کا خاتمہ کرنے کی کوشش ہوتی تھیں۔ عبداللہ مامون بن ہارون الرشید (170ھ۔۔218ھ) اور اس کے زیرک سیاسی مشیروں نے یہ فیصلہ کر کے اس پر عملدرآمد کرنا شروع کیا۔ جب مامون نے یہ فیصلہ کیا اس وقت وہ صوبہ خراسان کے مشرق میں واقع مرو شہر میں تھا (اس وقت مرو ترکمانستان کا علاقہ ہے) کیونکہ اس کے باپ ہارون نے اسے فارس کا حکمران بنایا تھا اور اس علاقہ میں اس کا اثر ورسوخ زیادہ تھا۔ اس نے امام رضا علیہ السلام سے مدینہ میں خط وکتابت شروع کر دی اور انہیں اپنے پاس آنے کی دعوت دی لیکن امامؑ مدینہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور آپؑ کو مامون کا قرب حاصل کرنے میں بھی کوئی رغبت وشوق نہ تھا۔

پھر مامون نے امام علی رضا علیہ السلام کو مدینہ سے خراسان منتقل کرنے کیلئے باقاعدہ ایک حکومتی وفد بھیجا جو اس کے دو وزیروں فضل بن سہل اور حسن بن سہل کے رشتہ دار رجاء بن ضحاک کی سربراہی میں مدینہ آیا۔ رجاء بن ضحاک مامون کی فوج کا جرنیل تھا اور وہ ایک مدت تک خراسان کا گورنر بھی رہ چکا تھا۔ یہ فوجی اور سیاسی شخصیت کا مالک تھا۔ مامون کا ایسے شخص کو یہ ذمہ داری پوری

کرنے کا ٹاسک دینا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ مامون اس بات کا مصمم ارادہ کر چکا تھا اور وہ ہر صورت میں اس کام کو پورا کرنا چاہتا تھا۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام 201 ہجری کے وسط میں مدینہ سے مرو کیلئے روانہ ہوئے جب آپؑ مرو پہنچ گئے تو مامون نے آپؑ کو یہ پیش کش کی کہ وہ آپؑ کیلئے منصب حکومت وخلافت خالی کر دیتا ہے جیسا کہ بعض روایات اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ دراصل اس کی یہ پیش کش اصل ہدف ومقصد کیلئے ایک تمہید اور ابتداء تھی، اس کا اصل ہدف ومقصد یہ تھا کہ اس کی طرف سے آپؑ کو ولی عہد نامزد کرنا آپؑ قبول فرمالیں۔ لیکن امام رضا علیہ السلام نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مامون اور اسکے دو وزیروں فضل بن سہل اور حسن بن سہل کی طرف سے دو مہینے یا اس سے بھی زیادہ عرصہ تک آپؑ کو اس منصب کو قبول کرنے کیلئے مسلسل کوشش ہوتی رہیں۔(۱) جب مامون نے دیکھا کہ وہ آپؑ کو کسی طرح بھی اس کیلئے راضی اور قائل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تو اس نے زبردستی اور دھمکی آمیز رویہ اپنایا۔

ابوالفرج اصفہانی (284ھ۔۔356ھ) نے اپنی کتاب ''مقاتل الطالبیین'' میں ذکر کیا ہے:

''مامون نے فضل بن سہل اور حسن بن سہل کو علی ابن موسیٰ الرضا علیہ السلام کے پاس بھیجا انہوں نے آپؑ کو مامون کے ارادے سے باخبر کرتے ہوئے ولی عہدی کی پیش کش کی جسے آپؑ نے ٹھکرا دیا مگر وہ مسلسل اصرار کرتے رہے اور آپؑ ولی عہدی قبول کرنے سے انکار کرتے رہے پھر ان میں سے ایک نے آپؑ سے کہا: آپؑ اسے قبول کر لیں ورنہ ہمیں آپؑ کے خلاف کوئی کاروائی کرنا پڑے گی اس نے آپؑ کو دھمکی دی، پھر دوسرے نے آپؑ سے کہا: خدا کی قسم! مامون نے مجھے حکم دیا ہے کہ اگر آپؑ اس کے ارادے کی مخالفت کریں تو آپؑ کی گردن اڑا دی جائے۔ پھر مامون نے خود آپؑ کو بلایا اور اس حوالے سے گفتگو کی۔ لیکن آپؑ نے اس کی پیش

۱۔ سید جعفر مرتضیٰ، الحیاۃ السیاسیۃ للامام الرضاؑ ص280، 1986م (بیروت: دار الاضواء)

کش کو ٹھکرا دیا تو اس نے آپؑ سے دھمکی آمیز گفتگو کرتے ہوئے کہا: حضرت عمر نے آپؑ کے دادا (حضرت علیؑ) کو شوریٰ کے چھ (6) افراد میں رکھا تھا اور اس نے کہا تھا کہ ان میں سے جو بھی مخالفت کرے اس کی گردن اڑا دینا۔ لہٰذا آپؑ کو ضرور ولی عہدی قبول کرنا ہوگی۔'' (۱)

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے دیکھا کہ آپؑ کو دو میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا ہے یا تو مامون کی ولی عہدی کی پیش کش قبول کرلیں یا مامون کے ساتھ ٹکرائیں۔ آپؑ کی رائے کے مطابق ولی عہدی کو قبول کرنا زیادہ بہتر تھا لہٰذا آپؑ نے ولی عہدی کو اس شرط کے ساتھ قبول کرلیا کہ سیاسی اور تنفیذی امور کی ذمہ داری آپؑ پر نہ ہوگی۔ آپؑ کسی کو حکومتی عہدے پر نامزد نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کو معزول کریں گے اور جو چیز پہلے سے چلی آرہی ہے اس نظام حکومت میں ردوبدل نہیں کریں گے اور صرف دور سے مشورہ دیں گے۔ (۲)

آپؑ نے ان درج بالا شرائط کے ذریعے حکومتی نظام و سیاست اور ان کے امور سے خود کو الگ تھلگ کرلیا۔

مامون نے امام علی رضا علیہ السلام کی ولی عہدی کی مناسبت سے سیاسی و عوامی سطح پر بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا جس میں امام علی رضا علیہ السلام کی بیعت کی گئی یہ جشن ماہ رمضان المبارک کی دو یا پانچ یا سات تاریخ (باختلاف روایات) 201 ہجری کو منعقد ہوا جس میں حکومتی وزراء، زعماء و بڑی شخصیات، مسلح افواج کے جرنیلز و سپہ سالار، بنو عباس اور بنو علیؑ کے نمایاں افراد نے خصوصی شرکت کی۔ مامون نے شعراء کو انعامات سے نوازتے ہوئے اس واقعہ کو اشعار میں قلمبند کرنے اور امام رضا علیہ السلام کی مدح سرائی کرنے پر ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اس مناسبت سے مامون نے اپنی فوج کو پورے سال کی پیشگی تنخواہیں دینے کا حکم صادر کیا

۱۔ مقاتل الطالبیین، ص 563

۲۔ الحیاۃ السیاسیۃ للامام الرضاؑ، ص 347

اور درہم و دینار کے سکوں پر امام رضا علیہ السلام کا نام مبارک کندہ کروایا اور تمام اسلامی شہروں ،صوبوں اور علاقوں میں اپنے کارندوں اور گورنروں کو یہ حکم دیا کہ وہ تمام شہریوں سے امام رضا علیہ السلام کی بعنوان ولی عہد بیعت لیں اور نماز جمعہ کے خطبات میں ان کیلئے خصوصی دعا کریں۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانے کے سیاسی اسباب

کس بات نے مامون کو یہ عجیب اور خطرناک فیصلہ کرنے پر آمادہ کیا؟ اس کے خاندان کے گزشتگان کی اہل بیتؑ کے ساتھ دشمنی اور نفرت کے تعلق کے باوجود اس نے کس طرح اہل بیتؑ کو حکومت میں ظاہری طور پر شریک کر کے حکومتی اور عوامی سطح پر ان کی فضیلت اور قدر و منزلت کا اعتراف کیا ہے؟ تھوڑی سی تعداد میں مولفین اور ریسرچرز نے یہ نظریہ اپنایا ہے کہ مامون شروع سے ہی اپنے اس عمل میں مخلص تھا اور اس کے دل میں اہلبیتؑ کی سچی محبت اور ولاء تھی اور وہ اہلبیتؑ کا شیعہ تھا وہ بعض ایسے واقعات اور امور بیان کرتا تھا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آئمہ اہل بیتؑ کی امامت کو ضروری سمجھتا تھا۔ مثلاً مامون کا اپنے باپ ہارون الرشید کا حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کے ساتھ برتاؤ کا مشاہدہ کرنا پھر اس نے اپنے باپ سے ان کے بارے میں سوال کیا تو اس کے باپ ہارون نے جواب دیا کہ اس وقت یہ بلند شرعی قدر و منزلت رکھتے ہیں اور امت کی قیادت و رہبری کا سب سے پہلے ان کا ہی حق بنتا ہے۔ وہاں کئی ایسے امور ہیں جن سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ مامون شیعہ تھا جیسے اس کا اولاد علیؑ کو فدک واپس کرنا اور اس کے اپنے محل میں علم الحدیث اور علم الکلام کے چالیس علماء کو مناظرہ کیلئے اکٹھا کیا۔ اور انہوں نے یحیٰی بن اکثم کو منتخب کیا تو مامون نے ان کے ساتھ علمی مواد اور مضبوط استدلال سے بحث و مباحثہ کیا اور انہیں یہ بات سمجھائی کہ حضرت امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام تمام اصحاب سے افضل ہیں اور وہ سب سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے۔ اسی طرح مامون کا یہ قول کہ قرآن مخلوق ہے، متعہ کرنا جائز ہے اور اسی طرح کے دیگر مسائل جن کو مذہب اہل بیتؑ میں بیان کیا جاتا ہے وہ اس بات کی طرف

اشارہ کرتے ہیں کہ یہ شیعہ تھا۔اسی وجہ سے اس نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو پہلے خلافت کی پیشکش کی اور پھر ولی عہدی کی پیشکش کی۔

بعض مورخین اور ریسرچرز کا یہ نظریہ ہے کہ مامون نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں یہ نذر و منت مانی تھی کہ اگر اسے اپنے بھائی امین پر فتح حاصل ہوئی تو وہ یہ امیر حکومت اس امت کے افضل یعنی سب سے زیادہ بافضیلت شخص کے حوالے کردے گا اور اس دور کی افضل شخصیت حضرت امام علی رضا علیہ السلام تھے۔اس حوالے سے اس کا یہ قول منقول ہے۔

''میں نے خدا سے یہ عہد کیا تھا کہ میں یہ حکومت آلِ ابی طالبؑ میں سے سب سے افضل شخص کے سپرد کروں گا بشرطیکہ میں امین کو راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہوگیا اور میں کسی ایک شخص کے بارے میں بھی نہیں جانتا جو اس (امام علی رضاؑ) سے افضل و بہتر ہو۔''(۱)

جن افراد نے یہ نظریہ اپنایا ہے ان میں مولف کے دوست ڈاکٹر سید محمد علی البار بھی ہیں جو امام رضا علیہ السلام کے علم الطب میں رسالہ کی شرح کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

''مامون نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو خلافت پیش کرکے انہیں ان کے سب بھائیوں اور خاندان کے تمام افراد پر فضیلت بخشی اور وہ اس کام سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہتا تھا۔درحقیقت مامون نے امام علی رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد بنا کر عباسی خاندان کے جذبات کو بھڑکا دیا تھا اور ہوسکتا تھا کہ مامون کے ہاتھوں سے یہ خلافت نکل جاتی کہ جب بنو عباس نے اس کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلیفہ نامزد کیا کیونکہ مامون کے اس فعل کی وجہ سے خاندان بنوعباس کے افراد اس پر غضبناک تھے۔اس کے وزیر حسن بن سہل نے اسے مشورہ دیتے ہوئے نصیحت کی تھی کہ وہ حضرت علی رضا علیہ السلام کو اپنا ولی عہد نامزد نہ کرے کیونکہ اس کے ایسا کرنے سے تمام بنوعباس اور ان کے ساتھیوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑے گی جن کی تعداد کافی زیادہ

۱۔ مقاتل الطالبیین، ص563

ہے۔لیکن مامون نے ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ اور آخرت کے گھر کو ترجیح دی اور اپنے اس عمل سے امت کو نصیحت کی اور امام رضا علیہ السلام کو اپنے بعد ولی عہد بنایا بلکہ اس نے تو یہ چاہا تھا کہ وہ امام رضا علیہ السلام کی خاطر یہ خلافت کا منصب چھوڑ دیتا ہے لیکن امام رضا علیہ السلام نے خلافت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔''(۱)

جو شخص مامون کی شخصیت اور اس کے سیاسی اقدامات کا مطالعہ یوں شروع کرتا ہے کہ اس نے سب سے پہلے اپنے بھائی امین سے جنگ کر کے اسے قتل کیا پھر اس کے سر کو اپنے گھر کے صحن میں سولی پر لٹکا دیا تا کہ اس پر ہر وہ شخص

لعنت کرے جسے مامون نے نوازا ہے پھر امین کے سر کو خراسان میں پھروایا گیا، اس کا وزیر فضل بن سہل، جس نے مامون کی حکومت مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا اس نے اسے بھی قتل کرنے کی سازش تیار کرتے ہوئے مروا دیا۔اسی طرح مامون نے اپنی فوج کے سب سے بڑے جرنیل ہرثمہ بن اعین کا صفایا کروایا اور اپنی فوج کے اہم جرنیل طاہر بن حسین اور اس کے بیٹوں سے چھٹکارا پانے کیلئے جال تیار کروایا۔(۲)

ان درج بالا تخریب کاریوں کے علاوہ سب سے اہم وہ بات ہے جس کی طرف تاریخی روایات اشارہ کرتی ہیں کہ امام رضا علیہ السلام کو زہر دے کر قتل کرنے کے پیچھے مامون کا ہاتھ تھا۔ یہ تمام امور اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ امام علی رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانے میں شروع ہی سے مخلص اور سچا نہیں تھا بلکہ وہ اس کا ایک سیاسی حربہ تھا۔ان سیاسی اسباب کو جاننا اور تحقیق کرنا ضروری ہے۔بسا اوقات تحقیق کرنے والا کسی جہد اور زیادہ غور و فکر کے بغیر نتیجہ تک پہنچ جاتا ہے کہ اس کے اس فعل کے پیچھے کیا محرکات تھے۔

۱۔ محمد علی البار ''الامام الرضا و رسالتہ فی الطب''، ص 77 تیسرا ایڈیشن 1992م (بیروت: دار المنھل)

۲۔ البدایۃ والنھایۃ، ج 10، ص 276-257

مامون کی حکومت کی بنیادوں کا متزلزل ہونا

ہارون رشید نے اپنے بیٹے محمد امین کو اپنا ولی عہد بنایا اور اپنے بیٹے عبداللہ مامون کو اس کے بھائی امین کا ولی عہد نامزد کیا حالانکہ مامون، امین سے چند ماہ بڑا تھا اور یہ اس سے زیادہ زیرک اور مضبوط شخصیت کا مالک تھا لیکن وہ ایک عجمی کنیز کا بیٹا تھا جبکہ امین کی ماں زبیدہ، منصور دوانیقی (عباسی حکمران) کی پوتی تھی۔ ہارون رشید کے دورِ خلافت میں اس کے احکامات چلتے تھے اور اس کا حکومت میں کافی اثر ورسوخ تھا۔ خاندان بنوعباس امین کے طرفدار تھے اسی طرح خاندان برامکہ جن کا مملکت میں اچھا خاصا نفوذ ہو چکا تھا وہ بھی امین کی حمایت کر رہے تھے اور عربی علاقے عموماً امین کے طرفدار تھے۔ ان تمام گروہوں نے امین کو زمام خلافت سنبھالنے کے بعد اس بات پر اکسایا کہ وہ اپنے بھائی مامون کو ولی عہدی سے معزول کر کے اپنے بیٹے موسیٰ کیلئے بطور ولی عہد بیعت لے جبکہ اس وقت اس کا بیٹا موسیٰ ابھی پنگھوڑے میں آرام کرنے والا چھوٹا بچہ تھا۔ ان باتوں نے مامون کو غضبناک کر کے انتقام پر اکسایا۔ لہٰذا مامون نے اپنے بھائی امین کو خلافت سے ہٹانے کیلئے اقدامات شروع کر دیئے اور اس نے امت پر اپنی خلافت اور حکومت کا اعلان کر دیا اور اپنے بھائی کی فوج کا مقابلہ کرنے کیلئے ایک بڑا لشکر تیار کیا دونوں لشکروں میں ''رے'' کے مقام پر آمنا سامنا ہوا اور گھمسان کی جنگ ہوئی جس میں خون کی نہریں جاری ہوئیں اور بالآخر امین کی فوج کو شکست ہوئی۔ مامون کا لشکر پیش قدمی کرتے ہوئے آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ دارالخلافہ بغداد کا محاصرہ کر لیا گیا اور امین کو قتل کرنے کے بعد اس کا سر اس کے بھائی مامون کو بھیج دیا گیا۔

مامون نے اپنے بھائی امین پر فتح حاصل کر لی لیکن وہ بنوعباس اور عربوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکا۔ اسی بناء پر بنوعباس نے بعد میں مامون کے چچا ابراہیم بن مہدی کو خلافت کیلئے منتخب کیا تا کہ اس کی خلافت کیلئے بیعت کریں حالانکہ وہ ایک گلوکار تھا اور اسے سیاسی سوجھ بوجھ بالکل بھی نہ تھی۔

دوسری طرف مختلف علاقوں میں مسلسل علویوں کی انقلابی تحریکیں سر اٹھا رہی تھیں اور یہ حکومت کو کمزور کرنے کے ساتھ اس کی بنیادوں کو ہلا رہی تھیں۔ ابوالسرایا نے کوفہ اور زید النار بن موسیٰ (کاظمؑ) بن جعفر صادق علیہم السلام نے بصرہ میں خروج کیا۔ زید کو زید النار اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے بصرہ میں عباسیوں کے گھروں کو آگ سے جلا دیا تھا۔ محمد بن جعفر نے مکہ، ابراہیم بن موسیٰ بن جعفر نے یمن، محمد بن سلیمان بن داؤد بن حسن نے مدینہ، جعفر بن محمد بن زید اور حسین بن ابراہیم بن حسن نے واسط، محمد بن اسماعیل بن محمد نے مدائن میں خروج کیا۔

بعض مورخین کے مطابق اس وقت کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں بنو عباس کے خلاف علوی یا ان کے ہم فکر لوگ تحریک نہ چلا رہے ہوں۔(۱)

یہ انقلابی تحریکیں ان تحریکوں سے الگ تھیں جو غیر علوی چلا رہے تھے جبکہ علویوں کے علاوہ دیگر افراد نے بھی کئی بغاوتی تحریکیں چلائیں جیسے حسن الھرش نے 198ھ میں خروج کیا۔ حاتم بن ہرثمہ نے ارمینیہ پر غلبہ پالیا، نصر بن شبث نے کیسوم سیمساط اور اس کے گردونواح کے علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح زط، بابک اور مصریوں کی تحریکیں بھی سر اٹھائے ہوئے تھیں۔

مامون کا حکومت کو معزز بنانے کیلئے امام رضا علیہ السلام کو ولی عہد بنانا

درج بالا بڑے چیلنجز جو مامون کو درپیش تھے اور اس کی حکومت کو کمزور کرنے کے ساتھ اسکی بنیادیں ہلا رہے تھے، ضروری تھا کہ وہ ذہانت اور بہادری کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتے ہوئے حالات تبدیل کرے اور کوئی ایسا فیصلہ کرے جو مامون کے فائدے میں ہو اور لوگوں کے موقف کا رخ اس کیطرف موڑ دے۔

مامون اس قدر ذہانت اور علم و معرفت رکھتا تھا کہ وہ کوئی ایسا فیصلہ کرے جو حالات و واقعات کا رخ موڑ دیں۔

۱۔ الحیاۃ السیاسیۃ للامام الرضاؑ، ص184-183

جیسا کہ بعض مورخین نے تحریر کیا ہے: ''بنوعباس میں مامون سے زیادہ علم رکھنے والا کوئی نہ تھا'' اور استاد محمد فرید وجدی نے بیان کیا ہے: ''خلفاء راشدین کے بعد مامون سے زیادہ کوئی خلافت کی اہلیت وقابلیت نہیں رکھتا تھا۔''(۱)

بلکہ حضرت امام علی علیہ السلام سے ایک روایت میں منقول ہے کہ آپؑ نے بنوعباس کے خلفاء کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا۔''بنوعباس کا ساتواں خلیفہ ان میں سب سے زیادہ علم رکھتا ہوگا۔'' (۲)

اس نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے اس فیصلے کا اظہار کیا کہ وہ حکومت وخلافت کو حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی شخصیت کے ذریعے عزت وبزرگی عطا کرے گا اور انہیں اپنا ولی عہد نامزد کرے گا کیونکہ امام علی رضا علیہ السلام کی شخصیت امت اسلامیہ میں قابل احترام اور مقبول ومعروف تھی۔آپؑ آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے آٹھویں امام تھے اور شیعیان حیدر کرار آپ کے حبدار اور اطاعت گزار تھے جیسا کہ خود مامون نے آپؑ کی تعریف کرتے ہوئے بیان کیا: ''یہ (امام رضاؑ) روئے زمین پر بہترین فرد اور سب لوگوں سے زیادہ اہل علم اور عبادت گزار ہیں'' سب لوگ آپؑ کی عزت وتکریم کرتے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے آپؑ کے فرزند حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کے بقول آپؑ کو اس وجہ سے ''رضا'' کا لقب دیا گیا کیونکہ ''آپؑ سے آپؑ کے مخالفین اور دوست سب راضی وخوش تھے۔''(۳)

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی عظیم شخصیت اور قدر ومنزلت کو سمجھنے کیلئے ہم دو واقعات بیان کرتے ہیں تاکہ ہم ان کی روشنی میں یہ فیصلہ کرسکیں اسوقت لوگوں کی نظروں میں آپؑ کا کیا مقام ورتبہ تھا۔

۱۔ محمد فرید وجدی، دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ج ا،ص 620 تیسرا ایڈیشن 1971ء (بیروت دار العصرفۃ)
۲۔ الشیخ عباس قمی، سفینۃ البحار، ج 2 مادہ غیب،ص 332 پہلا ایڈیشن 1414ھ (قم: دار الاسوۃ)
۳۔ باقر شریف القرشی، حیاۃ الامام علی بن موسیٰ الرضا، ج 1 ص 23، پہلا ایڈیشن 1992ء (بیروت: دار المرتضیٰ)

جب مامون نے اپنے مدینہ کے گورنر عبدالجبار بن سعد المساحقی کو خط میں تحریر کیا کہ تم لوگوں کے سامنے خطاب کرو اور ان سے حضرت علیؑ بن موسیٰؑ کی بیعت لو تو اس نے خط پڑھنے کے بعد لوگوں کو جمع کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

''اے لوگو! جو کام چاہتے تھے وہ ہو گیا ہے، جس عدل وانصاف کا تم انتظار کر رہے تھے وہ عدل وانصاف قائم ہو گیا ہے، جس بھلائی کی تم امید کرتے تھے وہ بھلائی آ چکی ہے اور وہ یہ کہ علیؑ بن موسیٰؑ بن جعفرؑ بن محمدؑ بن علیؑ بن حسینؑ بن علیؑ بن ابی طالب علیہم السلام کو ولی عہد بنا دیا گیا ہے۔ ان کے چھ آباء واجداد روئے زمین کے بہترین اور برتر افراد ہیں۔''(۱)

مدینہ کے گورنر کی گفتگو کے مطابق امام رضا علیہ السلام حجاز کے لوگوں کے نزدیک وہ عدل ہیں جس کے لوگ منتظر تھے اور وہ بھلائی ہیں جس کی لوگ امید لئے ہوئے بیٹھے تھے اور وہ امر ہیں جس کو لوگ پسند کرتے تھے۔

دوسرا واقعہ جو مشرقی اسلامی ممالک میں امام رضا علیہ السلام کے مقام ومرتبہ کو ظاہر کرتا ہے یہ وہ واقعہ ہے جو مورخین نے آپؑ کے نیشاپور میں داخل ہونے کا منظر بیان کیا ہے۔ آپ ''مرو'' جاتے ہوئے نیشاپور سے گزرے تھے ہم یہ واقعہ ابن حجر الھیثمی سے نقل کرتے ہیں جو اس نے اپنی کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' میں تحریر کیا ہے وہ بیان کرتا ہے:

''جب آپؑ نیشاپور میں داخل ہوئے تو نیشاپور کے بازار میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی آپؑ کی سواری پر چھتری تھی اس چھتری کے پیچھے سے آپؑ کو نہیں دیکھا جا سکتا تھا آپؑ کا استقبال کرنے والوں کے آگے حافظ الحدیث ابوزرعہ رازی اور حافظ الحدیث محمد بن اسلم طوسی تھے ان کے ہمراہ اہل علم وحدیث کی کثیر تعداد تھی، ان دونوں نے عاجزانہ التجاء کرتے ہوئے کہا کہ آپؑ حاضرین کو اپنے رخِ انور کی زیارت کروائیں اور اپنے آباؤ اجداد سے منقول احادیث سنائیں تو

۱۔ ابن عبدربہ اندلسی، العقد الفرید ج5 ص359 (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)

آپؑ نے اپنے خچر کو رکنے کا حکم دیا اور غلاموں سے فرمایا کہ اس چھتری کو اوپر سے ہٹا دو تو تمام حاضرین نے آپؑ کے چہرے مبارک کی زیارت کر کے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی اس وقت آپؑ کی دراز زلفیں آپؑ کے شانوں پر گر رہی تھیں۔ اس وقت تمام لوگ شدت جذبات سے آہ و زاری کر رہے تھے کچھ زمین پر گر کر لوٹنے لگے اور کچھ لوگ آپؑ کی سواری کے قدم چومنے کے اشتیاق میں آگے بڑھ رہے تھے، اتنے میں علماء نے بلند آواز میں کہا: اے لوگو! خاموش ہو جاؤ ،تو ہر طرف خاموشی چھا گئی پھر دونوں حافظان حدیث نے آپ سے حدیث لکھوانے کی درخواست کی تو آپؑ نے فرمایا:

'' حَدَّثَنِیْ اَبِیْ مُوْسَیٰ الْکَاظِمِ عَنْ اَبِیْهِ جَعْفَرَ الْصَّادِقِ، عَنْ اَبِیْهِ مُحَمَّدٍ الْبَاقِرُ، عَنْ اَبِیْهِ زَیْنُ الْعَابِدِیْنَ، عَنْ اَبِیْهِ الْحُسَیْنِ، عَنْ اَبِیْهِ عَلِی اِبْنِ اَبِیْطَالِبِ، قَالَ حَدَّثَنِیْ حَبِیْبِیْ وَ قُرَّةَ عَیْنِیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ قَالَ: حَدَّثَنِیْ جَبْرَائِیْلَ قَالَ : سَمِعْتُ رَبَّ الْعِزَّةِ یَقُوْلَ : لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهِ حِصْنِیْ، فَمَنَ قَالَهَا دَخَل حِصْنِیْ ، وَمَنْ دَخَلَ حِصْنِیْ اَمَنَ مِنْ عَذَابِیْ ''

''مجھے میرے بابا جان حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام نے یہ بتایا، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت جعفر صادق علیہ السلام سے یہ سنا، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت محمد باقر علیہ السلام سے سنا، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت زین العابدین علیہ السلام سے سنا، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت حسین علیہ السلام سے سنا، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام سے سنا اور حضرت علی ابن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے میرے حبیب اور آنکھوں کی ٹھنڈک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بتایا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سلم نے فرمایا: مجھے جبرائیلؑ نے یہ خبر دی ہے کہ میں نے اللہ رب العزت کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کلمہ لا الہ الا اللہ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں) میرا مضبوط قلعہ ہے جس نے اس کلمے کا اقرار کیا وہ میرے مضبوط قلعہ میں داخل ہو گیا اور جو میرے مضبوط قلعہ میں داخل ہو گیا وہ میرے عذاب

سے بچ گیا اور محفوظ ہو گیا۔''

پھر آپؑ نے عماری کا پردہ نیچے گرایا اور چل پڑے اس وقت جو لوگ ہاتھوں میں قلم دوات لئے آپؑ کی یہ بات لکھ رہے تھے انہیں شمار کیا گیا تو وہ بیس ہزار سے زیادہ تھے۔(۱)

''دیگر مورخین نے مزید یہ بیان کیا ہے کہ حضرت علی رضا علیہ السلام کی سواری چند قدم آگے بڑھنے کے بعد آپؑ نے اسے روکنے کا حکم دیا اور اپنا چہرہ مبارک عماری سے باہر نکال کر فرمایا: ولکن بشروطھا وانا من شروطھا، یعنی کلمہ لا الا اللہ پڑھنے کے بعد بھی اس کے عذاب سے محفوظ رہنے کی شرائط ہیں اور ان شرائط میں سے ایک شرط میری امامت پر ایمان رکھنا ہے۔ گویا آپؑ نے عقیدہ توحید کی قبولیت کو عقیدہ امامت پر ایمان سے مشروط فرمایا۔ مترجم)''

یہ درج بالا دونوں واقعات مشرق سے مغرب تک اور تمام عرب وعجم اور امت مسلمہ کے دلوں میں امام رضا علیہ السلام کی عظیم قدر ومنزلت اور بلند مقام ومرتبہ کو واضح کرتے ہیں۔ اسی بات نے مامون کو مجبور کیا کہ وہ امام رضا علیہ السلام کو اپنے ساتھ حکومت کا حصہ بننے پر اصرار کرے تا کہ وہ اسے قبول فرمالیں اور مامون انہیں اپنا ولی عہد نامزد کر کے اپنی حکومت کو عزت وشرف عطا کرنے کے ساتھ اسے جائز ثابت کر سکے اور علوی انقلابی تحریکوں کے آگے بند باندھ سکے اور امت کا اطمینان اور اعتماد حاصل کر سکے۔

حضرت امام رضا علیہ السلام کی حکمت عملی

مامون کی نیت میں کھوٹ اور اس کے سیاسی مفادات کی ہمارے پاس سب سے واضح دلیل حضرت امام رضا علیہ السلام کا خلافت اور ولی عہدی کو قبول کرنے سے انکار کرنا ہے۔ پھر آپؑ نے مجبوری میں ولی عہدی پر مشروط رضامندی کا اظہار کیا۔ جس میں یہ شرائط عائد کیں کہ میں کسی قسم کی سیاسی ذمہ داری کا بوجھ نہیں اٹھاؤں گا اور حکومتی معاملات سے الگ تھلگ رہوں گا اور کسی کو بھی

۱۔ الصواعق المحرقۃ، ج2 ص594

سیاسی عہدے پر متعین یا معزول نہیں کروں گا۔ آپؑ نے ولی عہدی کی بیعت کے سلسلہ میں منعقد جشن میں ہی اپنے ایک غلام سے فرمادیا تھا۔ ''تم جوامر حکومت کو دیکھ رہے ہو اس میں اپنے دل کو نہ لگاؤ اور اس سے خوش نہ ہو کیونکہ یہ کام پایہ تکمیل تک نہیں پہنچے گا۔''

آپؑ کا خادم یاسر بیان کرتا ہے کہ آپؑ ولی عہدی کے منصب پر متعین ہونے کے بعد ہمیشہ غمزدہ اور پریشان رہتے تھے یہاں تک کہ داعی اجل کو لبیک کہا۔

اگر امام رضا علیہ السلام کو مامون کی نیتوں میں اخلاص اور اچھائی نظر آتی تو کبھی بھی اس طرح کا معاملہ نہ کرتے بلکہ شروع میں ہی اس حق خلافت کو قبول کر لیتے۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو حکومت پر جو تحفظات تھے کیونکہ اس وجہ سے آپؑ نے عملی طور پر حکومت کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کے باوجود آپؑ نے سیاسی آزادی کی فرصت سے ہر ممکن استفادہ کرنے کی کوشش کی تا کہ حقیقی محمدی اسلام، دینی تعلیمات اور برحق و روشن مفاہیم کو لوگوں تک پہنچا سکیں۔ اسکو سمجھنے کیلئے درج ذیل امور میں خاص طور پر غور و فکر کیا جانا چاہیے۔

ا۔ فکری و ثقافتی چیلنجز کا مقابلہ

حضرت امام علی رضا علیہ السلام کے زمانے میں دوسری ثقافتوں خاص طور پر یونانی ثقافت کیلئے دروازے کھول دیئے گئے تھے۔ مامون نے دوسرے ممالک سے علمی و سائنسی اور فلسفی کتابوں کو لانے کا خاص اہتمام کیا اور بغداد میں موجود سب سے بڑی لائبریری ''مکتبہ دارالحکمت'' میں ایک خاص شخص کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ ان غیر عربی کتب کے ترجمہ کا اہتمام کرے جو قبرص سے لائی گئی تھیں اور جو کتابیں یونان سے منگوائی گئی تھیں۔ اسی طرح دوسری زبانوں کی کتب کو عربی زبان میں ترجمہ کرنے کیلئے حنین بن اسحاق کی سربراہی میں ایک ترجمے کا شعبہ قائم کیا گیا۔ اس ثقافتی وسعت نظری سے امت مسلمہ کے اندر ایک ثقافتی اور فکری انقلاب برپا ہوا تا کہ وہ دوسروں کی انحرافاتی افکار سے متاثر ہوئے بغیر ان کے تجربات اور نظریات سے استفادہ کریں۔

۲۔ اہل بیت علیہم السلام کے راستے کے گرد حصار قائم کرنا

مذہب شیعہ کے اندر بعض غالی گروہوں اور مفاد پرست ٹولوں جیسے واقفہ کی طرف سے فکری اور نظریاتی طور پر انحراف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ اسی طرح امت اسلامیہ کے اکثر لوگوں کو اہلبیتؑ کے راستے پر چلنے کیلئے فکری و سیاسی تعلیمات سے آگاہی حاصل نہیں تھی بلکہ وہ لوگ مکتب اہلبیتؑ کے خلاف بہتان تراشی اور اعتراض و اشکالات کرنے والے دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔ لہٰذا امام علی رضا علیہ السلام نے ایسے حالات میں اہل بیت علیہم السلام کی فکری و سیاسی تعلیمات سے امت اسلامیہ کو روشناس کرایا اور اہلبیت علیہم السلام کے نظریات و عقاید اور روش و راستہ کے گرد علمی حصار قائم کر کے خالص شیعی عقاید کی حفاظت کی۔

۳۔ سیاسی جھگڑے

بنوامیہ اور بنوعباس کے درمیان لڑائی جھگڑے اور بنوعباس کی حکومت کے اندر واقع نزاع اور اختلاف جیسے امین اور مامون کی جنگ، سیاسی بے چینی اور حکومتی اداروں کی زبوں حالی نے امت اسلامیہ کے اندر ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ لوگ ردعمل دکھانے لگے اور وحدت کے درمیان رخنے پیدا ہونے لگے اور یہ اختلافات و نزاعات بعض معتبر اور ثقہ افراد کے آپس کے دینی معاملات میں بھی ظاہر ہوئے جس نے لوگوں کی اصل توجہات کو کمزور کر دیا اور ہر کوئی اپنے مادی اور ذاتی مفادات کے بارے میں سوچنے لگا۔

ان برے حالات میں امت کو دینی رہنمائی اور ایک ایسی تحریک کی ضرورت تھی جو تحریف اور انحرافات سے دور ہو اور اسلام کے صحیح مفاہیم اور حقائق کو امت پر آشکار کرے۔

زیادہ تر آئمہ معصومین علیہم السلام نے جن حالات میں زندگی بسر کی ہے وہاں انہیں اسلام کی حقیقی تعلیمات پھیلانے کا محدود موقع میسر آیا لیکن آپ اس کے باوجود ان سخت حالات کا

مقابلہ کرتے اور ہر ممکن وسیلہ کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے پیغام کو لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کرتے۔ باقی آئمہ معصومین علیہم السلام کی نسبت حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو کھلی سیاسی فضاء اور ماحول میسر آیا۔ جس سے آپؑ کو اسلام کے صحیح مفاہیم اور حقائق لوگوں تک پہنچانے کیلئے وسیع پیمانے پر موقع ملا، خاص طور پر عباسی خلیفہ مامون کا حضرت امام علی رضا علیہ السلام اور اہل بیتؑ کیلئے اخلاص کا دکھاوا کرنے کی کوشش اور اس نے بظاہر ایسا ماحول مہیا کیا کہ اہل بیت علیہم السلام کی آراء، افکار اور نظریات حکومتی اداروں اور اراکین تک پہنچ سکیں۔

حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اس وقت جو علمی کردار ادا کیا اسے سمجھنے کیلئے ہم ان مناظرات اور علمی گفتگو کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آپؑ کے اور اس زمانے کی دیگر علمی شخصیات کے درمیان ہوئیں۔ ان میں سے کچھ مناظرے مامون عباسی کی طرف سے دعوت دینے پر اس کے محل میں منعقد ہوئے اور اس کا مقصد یا تو اہل بیت علیہم السلام کی بظاہر تائید وحمایت کرنا تھا یا سخت اعتراضات اور مشکل مسائل پوچھ کر آپؑ کی شخصیت کو نقصان پہنچانا تھا۔ مامون نے مختلف اسلامی شہروں کے گورنروں کو یہ حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے ان علماء کو خراسان بھیجیں جو مختلف علوم پر دسترس رکھتے ہوں پھر مامون نے ان علماء کرام سے کہا وہ سب سے مشکل مسائل اور دقیق ترین اعتراضات کو تلاش کر کے امام رضا علیہ السلام کے سامنے پیش کریں جبکہ امام علی رضا علیہ السلام ان سوالات کے جوابات عنایت فرماتے اور کھلے دل سے ان اشکالات کی گتھیاں سلجھاتے اور اپنے مضبوط دلائل اور واضح بیان سے مدمقابل کو مطمئن کرتے۔ امام علی رضا علیہ السلام کے بعض شاگردوں نے ان مناظرات اور علمی مباحثوں کو جمع کیا ہے اور یہ مختلف علوم میں بیس ہزار سے زیادہ سوالات ہیں لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج ان سوالات میں سے بہت تھوڑے ہماری دسترس میں ہیں حالانکہ یہ ایک مفید اور قیمتی علمی سرمایہ ہے۔

''ان مناظرات کا اکثر علمی مواد ہمیں نہیں ملتا شاید یہ علمی مواد ان مخطوطات کی شکل میں تھا جو عربی اور اسلامی دنیا نے ضائع کر دیئے ہیں۔''(۱)

ان مناظرات میں سے ایک وہ مناظرہ ہے جو امام علی رضا علیہ السلام نے عمران صابی کے ساتھ کیا تھا۔ یہ صائبہ گروہ کا سرغنہ، لیڈر اور اس زمانے کے بڑے فلاسفروں میں سے ایک تھا۔ مامون اور اس کے دربار کے بڑے علماء اور سرداروں کی موجودگی میں یہ مناظرہ ہوا اور کئی ادوار ہوئے اس مناظرے میں جو گفتگو ہوئی اس میں سے زیادہ تر شیخ صدوقؒ نے اپنی کتاب ''عیون اخبار الرضاؑ'' میں تحریر کی ہے۔ اس مناظرہ کے بعد عمران صابی نے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا اور وہ مکتب اہلبیت علیہم السلام کا پیروکار بن گیا۔ اس کے بعد وہ اکثر امام رضا علیہ السلام کی بارگاہ میں حاضر ہوتا اور ان کے علم کے چشمے سے سیراب ہوتا۔

اسی طرح امام علی رضا علیہ السلام نے سلیمان مروزی سے مناظرہ کیا جو کہ فلسفہ اور علم الکلام کی ابحاث میں خاص قابلیت رکھتا تھا۔ یہ خراسان کے سرکردہ علماء میں شمار کیا جاتا تھا۔ آپؑ نے اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات و اسماء کی حقیقت کے متعلق گہری علمی گفتگو فرمائی۔ اس طرح آپؑ نے ابوقرہ کے ساتھ مناظرہ کیا جو کہ عقائد اور دینی مفاہیم پر بہت زیادہ اشکالات اور شبہات پیدا کرتا تھا۔ امام علی رضا علیہ السلام نے عیسائیوں کے پادریوں کے سردار جاثلیق، یہودی علماء کے سربراہ راس الجالوت، ہندوؤں کے رہنما ہربذ اکبر، زردشتیوں کے پیروکاروں، معروف رومی طبیب نسطاس اور علی بن جہم کے ساتھ انبیاء کی عصمت وغیرہ کے حوالے سے مناظرے کئے اور اپنی علمی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

ان مناظرانہ مجالس اور علمی بحث و مباحثہ کی وجہ سے حضرت امام علی رضا علیہ السلام کو بہترین موقع ملا کہ آپؑ دینی مفاہیم اور شریعت کے احکامات کو واضح فرما سکیں ان باتوں کا

۱۔ حیاۃ الامام علی ابن موسیٰ الرضا ج 1، ص 13

امت کے علماء اور عوام پر گہرا اثر ہوتا اور وہ آپؑ کی شخصیت کے ذریعے مزید حقائق کی معرفت حاصل کرتے اور دین اسلام پر اطمینان کا اظہار کرتے۔

امام علی رضا علیہ السلام نے تعلیم و تربیت کیلئے جو کوششیں فرمائی ہیں۔ آپؑ کے گرد جمع ہونے والے شاگردان اور حبدار جنہوں نے آپؑ سے حدیث کو نقل کیا اور آپؑ کے علوم و معارف کے چشموں سے سیراب ہوئے ایک محقق عالم نے ان کی تعداد کو تین سو ستاسٹھ (367) تک شمار کیا ہے۔(۱)

حضرت امام رضا علیہ السلام کی سیرت سے سبق

حضرت امام رضا علیہ السلام کا زمانہ ان زمانوں میں سے ایک ہے جس میں امت نے علوم اہلبیتؑ سے استفادہ کیا۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے سیاسی وسعت نظری و قلبی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دین کی بنیادی تعلیمات کی تبلیغ کی اور رسالت کے منہج کا دفاع کیا۔ امت اسلامیہ کے افراد کی روحانیت و معنویت کو بلند کیا اور دینی معاملات میں انہیں اعتماد اور اطمینان کی منزل عطا کی۔

جہالت یا داخلی تحریف و تبدل کی وجہ سے جو امور مسلمانوں پر مشتبہ ہو رہے تھے ان کی وضاحت فرمائی، اسلام کے مخالف افکار و نظریات اور دیگر ثقافتوں کے اثرات سے محفوظ رکھنے کیلئے امت مسلمہ کو حقیقی تعلیمات و نظریات سے روشناس فرمایا۔ حضرت امام علی رضا علیہ السلام نے اپنی سیرت و کردار سے ہر زمانے اور ہر نسل کے علماء اور فقہاء کو یہ پیغام دیا ہے کہ وہ عہدوں اور مناصب کو ذاتی مفادات اور خواہشات کیلئے طلب نہ کریں بلکہ ضروری ہے کہ وہ انہیں امت اسلامیہ کی خدمت اور دین کی نشر و اشاعت کیلئے استعمال کریں۔

۱۔ حیاۃ الامام علی ابن موسیٰ الرضا ج2، ص180

آج کے دور میں امت اسلامیہ کو فکری و نظریاتی سطح پر خطرناک تہذیبی و ثقافتی چیلنجز درپیش ہیں کیونکہ معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ تک منتقل کرنے کیلئے جدید ذرائع ابلاغ اور ٹیکنالوجی میسر ہے اور میڈیا بین الاقوامی سطح تک پیغام پہنچا رہا ہے۔ مگر عالمی سطح پر میڈیا اور دیگر ذرائع ابلاغ پر اسلام دشمن طاقتوں کا غلبہ ہے جس کی وجہ سے حقیقی مبلغین اسلام، حق کا پرچار کرنے والوں اور اللہ کی طرف بلانے والوں کی ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں اور وہ محدود مواقع پر اکتفاء نہ کریں بلکہ عملی میدان میں ان سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں اور حق کا پیغام ان جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعے ساری دنیا تک پہنچائیں۔

حضرت امام جواد علیہ السلام کی سیرت سے چند نمونے

حضرت امام جواد علیہ السلام کی سیرت سے چند نمونے

امت اسلامیہ جو اس وقت اپنی شناخت کو برقرار رکھنے اور اپنی اخلاقی اقدار پر کاربند رہنے کیلئے ثقافتی تہذیبوں کی جنگ کے درمیان زندگی گزار رہی ہے پس اس صورت میں امت اسلامیہ کو اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ انہیں آئمہ طاہرین علیہم السلام کی سیرت و کردار بتایا جائے کیونکہ آئمہ کی سیرت سے آگاہی ہونے کی بناء پر مسلمانوں کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین حاصل ہوگا اور وہ اس ثقافتی معرکے میں اپنی شناخت بچا سکیں گے کہ جو ثقافتی جنگ تمام امتوں کی شناخت مٹا دینے کے درپے ہے اور تمام ثقافتوں کو مغربی مادیت پرست ثقافت میں ضم کر دینا چاہتی ہے۔ ہمیں اپنے گزرے ہوئے زمانے میں اس بات کی ضرورت تھی کہ ان ہستیوں کی عملی زندگی کو نمونہ کے طور پر پیش کرتے جو ہمارے لئے قدوہ اور اسوہ حسنہ کی حیثیت رکھتی ہیں تا کہ آج کی نسل ان ہستیوں کی سیرت و کردار کی مدح سرائی کر رہی ہوتی۔ اہلبیت علیہم السلام کے ذکر کو اسی لئے زندہ کیا جاتا ہے تا کہ اس ضرورت کو پورا کیا جا سکے۔

کمسنی میں علم کا سمندر

حضرت امام تقی الجواد علیہ السلام کی ولادت باسعادت 195 ہجری میں ہوئی۔ آپؑ آئمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے نویں امام ہیں۔ آپؑ کی کنیت ابو جعفر ثانی ہے۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام کی کنیت بھی ابو جعفر ہے۔ لہٰذا دونوں میں فرق کرنے کیلئے آپؑ کو ابو جعفر ثانی کہا

جاتا ہے۔آپؑ کی شہادت 220 ہجری میں ہوئی۔تمام آئمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے آپؑ کی عمر سب سے کم ہے۔آپؑ کی عمر مبارک بوقت شہادت صرف پچیس (25) سال تھی۔اگرچہ آپ کی عمر مبارک کم تھی لیکن آپؑ نے اس مختصر مدت میں لامحدود فضل وعطا اور جود وسخا کے چشمے جاری فرمائے۔انسان کی قدر وقیمت اس کی عمر سے نہیں لگائی جاتی بلکہ اس کی قابلیت و صلاحیت، فضل وعطا اور جود وسخاء سے لگائی جاتی ہے۔حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام کی عمر مبارک تھوڑی تھی لیکن آپؑ کا نام ان عظیم ہستیوں میں آتا ہے جنہوں نے اپنی اقدار وروایات سے انسانی تاریخ کو خلود عطا فرمایا اور انسانی معاشرے کو عطا ہی عطا کیا ہے۔

امام جواد علیہ السلام کی امامت

حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام نے اپنے والد بزرگوار حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی 203 ہجری میں شہادت کے بعد امامت کی ذمہ داریوں کو کمسنی میں سنبھالا اس وقت آپؑ کی عمر مبارک آٹھ (8) برس تھی۔آپؑ کے والد گرامی امام رضا علیہ السلام نے آپؑ کی امامت پر نص بیان فرمائی تھی۔جیسا کہ شیعہ امامیہ کا یہ عقیدہ ہے کہ امامت نص اور تعیین کے ذریعے ثابت ہوتی ہے۔پہلے والا امام بعد میں آنے والے امام کی امامت پر واضح فرمان کے ذریعے ارشاد فرماتا ہے۔بعض اوقات کمسنی میں امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کی امامت پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے عقل میں آسکتا ہے کہ ایک آٹھ سال کا بچہ منصب امامت پر فائز ہو اور دین و دنیا کے امور میں امت اسلامیہ اس کی طرف رجوع کرے؟ اسی طرح حضرت امام علی نقی الہادی علیہ السلام اور حضرت امام مہدی علیہ السلام بھی کمسنی میں منصب امامت پر فائز ہوئے پس یہ کیسے ممکن ہے؟

شیعہ امامیہ کے عقیدہ کی رو سے اس اشکال اور سوال کا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ منصب امامت کی صلاحیت و قابلیت کسبی نہیں ہے بلکہ آئمہ علیہم السلام کا علم اللہ کی طرف سے الہام اور وصایت کے ذریعے ثابت ہوتا ہے۔یہ لوگوں سے علم حاصل نہیں کرتے اور علمی صلاحیت پیدا

کرنے کیلئے لوگوں کے آگے زانوئے تلمذ طے نہیں کرتے۔ پس جب اللہ عزوجل غیبی و اعجازی طریقہ سے آئمہ اطہارؑ کو الہام اور علم عطا کرتا ہے تو پھر کمسنی میں ان کے امام بننے پر شک وشبہ اور سوال کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ سوال کرنا کہ امام پر یہ مفہوم کیسے صادق آتا ہے یعنی کیا اللہ تعالیٰ انہیں امامت کے منصب کیلئے منتخب کرتا ہے یا ایسا نہیں ہے؟ اس موضوع پر الگ بحث ہے اور شیعہ امامیہ کے پاس اس حوالے سے ادلہ و براہین موجود ہیں کہ امامت کے منصب کیلئے یہ شرط ہے کہ اس پر نص موجود ہو اور وہ خدا و رسول کی طرف سے عہدہ امامت پر متعین کیا جاتا ہے اور احادیث و روایات کی روشنی میں آئمہ کا تعین کیا گیا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ہستیاں منصب امامت پر فائز ہوئیں ان میں امامت کیلئے مطلوبہ قابلیت و صلاحیت موجود تھی۔ قرآن مجید میں نبی خدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بتا رہا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے اس وقت منصب نبوت عطا فرمایا جب وہ گہوارے میں شیر خوار بچے تھے۔ شیعہ عقیدہ کے مطابق امامت، نبوت کا ہی تسلسل ہے، امام کا تعین بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے اس میں انسانوں کا عمل دخل نہیں ہوتا کہ امام کی صلاحیتیں کسبی ہوں یا اس نے کسی کی شاگردی اختیار کر کے یہ قابلیت و صلاحیت حاصل کی ہو ایسا ہرگز نہیں ہوتا ہے۔ نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ سب کیلئے سبق آموز ہے جیسا کہ ارشاد پروردگار ہوتا ہے:

''فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ قَالُوْا كَیْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِیْ الْمَهْدِ صَبِیًّا O قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتَانِیَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا''(۱)

ترجمہ: ''(جب لوگوں نے حضرت مریمؑ سے سوال کیا تم شادی کیئے بغیر یہ بچہ کہاں سے لائی ہو) تو حضرت مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا، اس پر لوگوں نے کہا کہ ہم گہوارے میں موجود بچے سے کیسے بات کریں؟ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بولتے ہوئے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا ہے۔''

۱۔ سورہ مریم آیت نمبر 30-29

اس پر تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام گہوارے میں ہی نبیؑ تھے۔قوم بنی اسرائیل نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بغیر باپ کے ولادت پر تعجب اور حیرت کا اظہار کیا۔ حالانکہ آپ کی ولادت ایک معجزانہ طریقے سے ہوئی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان لوگوں کے سوال کا جواب بھی معجزانہ طریقے سے دیا۔حضرت مریمؑ نے اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ فرمایا تھا کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے چپ کا روزہ رکھا ہوا تھا۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُکَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا'' (سورہ مریم آیت 26)

ترجمہ: ''میں نے خدائے رحمٰن کیلئے روزہ کی نذر و منت مانی ہے کہ میں آج کسی شخص سے بات نہیں کروں گی۔''

یہ بات سن کر ان لوگوں کی حیرت مزید بڑھ گئی کہ وہ اس شیر خوار بچے سے کیسے بات کریں کہ جس کی ولادت کو ابھی تھوڑے ہی دن گزرے ہیں؟ اور وہ اس بچے سے اس کی عجیب وغریب ولادت کے متعلق کیسے تفصیل وتفسیر طلب کریں؟ ابھی وہ لوگ اسی کشمکش میں مبتلا تھے کہ اس بچے (حضرت عیسیٰؑ) نے انہیں فوراً بولتے ہوئے جواب دیا:

''اِنِّیۡ عَبۡدُاللّٰہِ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا'' (سورہ مریم آیت 30)

ترجمہ ''بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب (انجیل) دی ہے اور نبی بنایا ہے۔''

اسی طرح قرآن مجید ہمیں حضرت یحییٰ بن زکریا علیہما السلام کے بارے میں بتاتا ہے۔ ارشاد پروردگار ہوتا ہے:

''یَا یَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ وَ اٰتَیۡنٰہُ الۡحُکۡمَ صَبِیًّا'' (سورہ مریم آیت نمبر 12)

ترجمہ: ''اے یحییٰ کتاب کو محکم تھام لو اور ہم نے انہیں بچپن میں حکمت عطا کی۔''

عربی زبان میں ''صبی'' نابالغ بچے پر بولا جاتا ہے۔ہم اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت اور

ارادے میں ہرگز شک نہیں کر سکتے۔ وہ یقیناً کمسنی میں علم وحکمت عطا کر سکتا ہے۔

اسی طرح سید الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا علم کسبی اور تحصیلی نہیں تھا اور آپؐ نے دنیا میں کسی سے علم حاصل نہیں کیا تھا بلکہ آپؐ کا سارا علم بھی عطیہ پروردگار تھا۔ جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ'' (سورہ عنکبوت آیت نمبر 48)

ترجمہ: اور (اے نبیؐ) آپ اس (قرآن) سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ ہی اسے اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو اہل باطل شبہ کر سکتے تھے۔''

اور ارشاد ربانی ہے:

'' وَ كَذٰلِكَ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتَابُ وَ لَا الْاِيْمَانُ ''(سورہ الشوریٰ آیت نمبر 52)

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے اپنے امر سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور نہ ہی ایمان کو جانتے تھے۔''

پس درج بالا بیان سے یہ واضح اور ثابت ہوتا ہے کہ چونکہ منصب امامت بھی نص، اور تعیین سے عطا کیا جاتا ہے لہٰذا اس کی اہلیتیں اور صلاحتیں بھی کسبی یا تحصیلی نہیں ہوتی ہیں۔ جب شیعہ اعتقاد کی رو سے حضرت امام محمد تقی جوادؑ کی امامت پر نص موجود ہے تو اس صورت میں ان کی امامت پر اس شک کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ انہیں کمسنی میں عہدہ امامت کیسے مل گیا حالانکہ اس سے پہلے کمسنی میں منصب نبوت خدا عطا کر چکا ہے۔

امام جواد علیہ السلام کی علمی برتری

حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کے علمی کارناموں کے حوالے سے بہت کم روایات ہم

تک پہنچی ہیں جو بعض کتابوں میں مذکور ہیں۔ بنوعباس کی طرف سے اہلبیتؑ کے حق کو جھٹلانے، ان پر اور ان کے گرد جمع ہونے والے افراد پر سختیوں کی وجہ سے یہ روایات ہم تک تھوڑی تعداد میں پہنچی ہیں۔ حضرت امام جواد علیہ السلام کے زمانے کے علماء اور حکومتی اراکین منصب امامت کیلئے آپؑ کی اہلیت وصلاحیت کے بارے میں شکوک وشبہات میں مبتلا ہو گئے تھے کہ آپؑ آٹھ سال کی عمر میں کیسے امامت کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ لوگوں کی سوچ یہ تھی کہ امت میں علماء کی کثیر تعداد، قضاۃ (ججز) اور حکومتی سرکردہ شخصیات کے ہوتے ہوئے امام جواد علیہ السلام کے گرد موجود بعض افراد آپؑ کی امامت کا دعویٰ کیونکر کر سکتے ہیں؟ اس وجہ سے یہ امامت آپؑ کیلئے ایک چیلنج اور سوال بن گئی اور پھر عملی طور پر آپؑ کو اس امتحان سے گزرنا پڑا اور حکومتی مراکز کی طرف سے خاندان اہلبیتؑ پر مزید سختیاں بڑھ گئیں کیونکہ حکومتی افراد قیادت و رہبری میں آپ کا مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ حضرت امام جواد علیہ السلام کی شخصیت اور کمالات کی برتری کا لوگوں پر ظاہر ہونا بنوعباس، قضاۃ اور ان کے حواریوں کو بالکل بھی پسند نہ آیا۔

تاریخ کی کتب میں یہ مذکور ہے کہ بنوعباس نے حضرت امام جواد علیہ السلام کی علم ومعرفت کا امتحان لینے کیلئے خلیفہ مامون کی موجودگی میں ایک علمی مناظرہ منعقد کروایا اور آپؑ سے مناظرہ کرنے کیلئے اس زمانے کے قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) یحییٰ بن اکثم کا انتخاب کیا گیا تاکہ وہ مشکل پیچیدہ سوالات کے ذریعے آپؑ کو لاجواب کر سکے۔ اس نے آپؑ سے درج ذیل سوال پوچھا:

اگر کوئی شخص حالت احرام میں شکار کرے تو اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟

اس پر امام جواد علیہ السلام نے فرمایا: اس شخص نے حرم کی حدود میں شکار کیا تھا یا حرم کی حدود سے باہر شکار کیا تھا؟ وہ اس حکم کے متعلق جانتا تھا یا جاہل تھا؟ اس نے جان بوجھ کر شکار کیا یا غلطی سے؟ حالت احرام میں شکار کرنیوالا غلام تھا یا آزاد؟ نابالغ تھا یا بالغ؟ پہلی دفعہ شکار کر رہا تھا یا پہلے بھی حالت احرام میں شکار کر چکا تھا؟ اس نے پرندے کو شکار کیا تھا یا کوئی اور

جانور شکار کیا؟ وہ پرندہ/ جانور چھوٹا تھا یا بڑا؟ وہ شکار کے بعد اپنے اس فعل پر نادم و پشیمان تھا یا اصرار کر رہا تھا؟ اس نے دن میں شکار کیا یا رات میں؟ اس نے شکار کے وقت عمرے کا احرام پہن رکھا تھا یا وہ حج کا احرام تھا؟

ایک سوال سے اتنی زیادہ فروعات سن کر یحییٰ بن اکثم حیران و پریشان ہو گیا اور اس کے چہرے سے عاجزی اور شکست کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ پھر مامون نے امام سے عرض کیا کہ آپؑ اس مسئلہ کی تمام فروعات کے جواب عنایت فرمائیں اس پر ابو جعفر (حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام) نے فرمایا: اگر کوئی شخص احرام باندھنے کے بعد ''حِل'' میں شکار کرے اور وہ شکار بڑا پرندہ ہو تو اس کا کفارہ ایک بکری ہے اور اگر ایسا شکار حرم میں کیا ہو تو دو بکریاں ہیں اگر کسی چھوٹے پرندے کو حِل میں شکار کیا تو دنبے کا ایک بچہ جو اپنی ماں کا دودھ چھوڑ چکا ہو کفارہ دے گا اور اگر حرم میں شکار کیا تو اس پرندہ کی قیمت اور ایک دنبہ کفارہ دے گا۔ اگر وہ شکار چوپایہ ہو تو اس کی کئی قسمیں ہیں اگر وہ وحشی گدھا ہو تو ایک گائے، اور اگر شتر مرغ ہو تو ایک اونٹ، اگر ہرن ہو تو ایک بکری کفارہ دے گا۔ یہ کفارہ اس وقت ہے جب شکار حِل میں کیا ہو لیکن اگر حرم میں کیا ہو تو یہی کفارہ دگنا ہو جائے گا اور ان جانوروں کو جنہیں کفارے میں دے گا اگر احرام عمرہ کا تھا تو خانہ کعبہ تک پہنچائے گا اور مکہ میں قربانی کرے گا اور اگر احرام حج کا تھا تو منیٰ میں قربانی کرے گا اور ان کفاروں میں عالم و جاہل دونوں برابر ہیں اور عمداً (جان بوجھ کر) شکار کرنے میں کفارہ دینے کے علاوہ گناہگار بھی ہوگا۔ ہاں بھولے سے شکار کرنے میں گناہ نہیں ہے۔ آزاد اپنا کفارہ خود دے گا اور غلام کا کفارہ اس کا مالک دے گا۔ چھوٹے بچے پر کوئی کفارہ نہیں اور بالغ پر کفارہ دینا واجب ہے اور جو شخص اپنے اس فعل پر نادم و پشیمان ہو وہ آخرت کے عذاب سے بچ جائے گا لیکن اگر اس فعل پر اصرار کرے گا تو آخرت میں بھی اس پر عذاب ہوگا۔

آپؑ کا یوں مفصل جواب سن کر مامون نے آپؑ کی تعریف و تحسین کرتے ہوئے دعا دی اور عرض کیا کہ اگر آپؑ یحییٰ سے کوئی سوال پوچھنا چاہیں تو آپؑ اس سے کوئی مسئلہ پوچھ سکتے ہیں

۔اس پر ابوجعفر (امام محمد تقی جوادؑ) نے یحییٰ بن اکثم سے سوال کیا:

اس شخص کے بارے میں مجھے بتاؤ جس نے صبح کے وقت ایک عورت پر نظر کی تو وہ اس پر حرام تھی، دن چڑھے حلال ہوگئی پھر ظہر کے وقت حرام ہوگئی، عصر کے وقت پھر حلال ہوگئی، غروب آفتاب کے وقت پھر حرام ہوگئی، عشاء کے وقت پھر حلال ہوگئی، آدھی رات کو حرام ہوگئی، صبح کے وقت پھر حلال ہوگئی، بتاؤ ایک ہی دن میں اتنی دفعہ عورت اس شخص پر کس طرح حرام و حلال ہوتی رہی؟

امامؑ کا یہ سوال سن کر یحییٰ بن اکثم مبہوت ہوگیا اور کوئی جواب نہ دے سکا، بالآخر انتہائی عاجزی کے ساتھ کہا کہ فرزند رسولؐ آپؑ ہی اس کی وضاحت فرمادیں اور ہمیں اپنی رائے سے مستفید فرمائیں۔تو امامؑ نے فرمایا:

وہ عورت کسی کی کنیز تھی، اسکی طرف صبح کے وقت ایک اجنبی شخص نے نظر کی تو وہ اس کیلئے حرام تھی، دن چڑھے اس نے وہ کنیز خرید لی تو حلال ہوگئی، ظہر کے وقت اس کو آزاد کردیا وہ حرام ہوگئی، عصر کے وقت اس نے نکاح کرلیا پھر حلال ہوگئی، مغرب کے وقت اس سے ظہار کیا تو پھر حرام ہوگئی، عشاء کے وقت ظہار کا کفارہ دے دیا تو پھر حلال ہوگئی، آدھی رات کے وقت اس شخص نے اس عورت کو طلاق رجعی دی جس سے پھر وہ حرام ہوگئی اور صبح کے وقت اس سے رجوع کرلیا تو یہ عورت اس مرد پر پھر حلال ہوگئی۔(۱)

محدث ابن حجر الھیثمی المکی (متوفیٰ 974) نے اپنی کتاب ''الصواعق المحرقۃ'' میں اس علمی مجلس میں ہونے والی بعض گفتگو کو ذکر کیا ہے۔(۲)

بحارالانوار میں مذکور ہے کہ علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے روایت نقل کی ہے ایک دفعہ مدینہ کے گرد و نواح کی ایک قوم نے ابوجعفر (حضرت امام محمد تقی جوادؑ) سے ملاقات کی اجازت

۱۔ الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد ج2، ص285

۲۔ الصواعق المحرقۃ ص204

طلب کی ،تو آپؑ نے انہیں ملنے کی اجازت دے دی تو وہ لوگ آپؑ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے ایک مجلس میں آپؑ سے تیس ہزار مسائل دریافت کئے جبکہ اس وقت آپؑ کی عمر مبارک صرف دس برس تھی۔ شیخ باقر مجلسیؒ اس روایت پر حاشیہ لگاتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ سوال و جوابات کی کثرت کے حوالے سے یہ کلام مبالغہ پر مبنی ہوسکتا ہے یا اس روایت میں ایک مجلس سے مراد وحدت نوعی یا ایک مکان جیسے منیٰ ہے اگرچہ کہ یہ سوالات کئی دنوں میں پوچھے گئے ہوں لیکن ایک ہی جگہ پر پوچھے گئے ہوں۔(۱)

درج بالا واقعات اور اسی طرح کے دیگر واقعات اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام منصب امامت کی اہلیت و صلاحیت کے مالک تھے اسی لئے خاندانِ اہلبیتؑ کے عالم و فقیہ علی بن امام جعفر صادق علیہ السلام اپنی کبرسنی ،علمی قدر و منزلت اور امام جوادؑ کے والد امام علی رضاؑ کے چچا ہونے کے باوجود آپؑ کے آگے خضوع و خشوع کا اظہار کرتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ آپؑ کمسنی کے باوجود امامت کے حقدار ہیں اور وہ آپؑ کی امامت و فضیلت کا اعتراف کرنے کے ساتھ آپؑ کیلئے احترام اور عاجزی کا اظہار کرتے۔

محمد بن حسن بن عمار سے منقول ہے کہ میں علی بن جعفر (صادقؑ) بن محمد (باقرؑ) کے پاس مدینہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ اچانک مسجد نبوی میں ابوجعفر محمد (تقیؑ) بن علی رضا علیہ السلام تشریف لائے تو علی بن جعفر (صادقؑ) تیزی سے جوتے اور رداء کے بغیر اپنی جگہ سے آپ کی جانب بڑھے اور آپؑ کی دست بوسی کرتے ہوئے تعظیم و تکریم کی تو ابوجعفر (امام محمد تقی الجوادؑ) نے آپؑ سے فرمایا: چچا جان! خدا آپ پر رحمت نازل فرمائے آپؑ تشریف رکھیں ،تو علی بن جعفرؑ نے عرض کیا: اے میرے سید و سردار! میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں جبکہ

۱۔ بحارالانوار ج50 ص93

آپ کھڑے ہیں! جب علی بن جعفرؒ واپس اپنی جگہ پر آئے تو آپ کے ساتھی آپ کو برا بھلا کہتے ہوئے کہنے لگے:

آپ اس کے والد کے چچا ہونے کے باوجود اس کی اس قدر تعظیم وتکریم کررہے ہو؟ تو علی بن جعفرؒ نے (اپنی داڑھی کو اپنی مٹھی میں پکڑتے ہوئے) کہا: خاموش ہوجاؤ، جب اللہ عزوجل نے اس بوڑھے کو اس (امامت وفضل) کے اہل نہیں سمجھا اور اس بچے کو اس کے اہل سمجھا اور اسے اس مقام پر بٹھایا ہے تو میں اس کی فضیلت کا کیسے انکار کرسکتا ہوں؟ تم لوگ جو کہہ رہے ہو میں اس بدگوئی سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔(۱)

امام جواد علیہ السلام کا جُود وسخاء

حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام کے جود وکرم، سخاوت اور کثرت سے عطا کرنے کی وجہ سے ''جواد'' لقب قرار پایا، جواد، جود سے بنا ہے اور اس کا مطلب کثرت سے عطا کرنا اور کریم ہونا ہے۔بعض اہل لغت کے مطابق ''جواد'' اسے کہتے ہیں جو سوال کئے بغیر بہت زیادہ عطا کرے۔(۲)

شاعر کا قول ہے:

وَمَا الْجُوْدُ مَنْ يُعْطِي اِذَا مَا سَالَتَهٗ   وَلٰكِنْ مَنْ يُعْطِي بِغَيْرِ سُوَالٍ

جواد اسے نہیں کہتے جس کے آگے ہاتھ پھیلایا جائے تو وہ عطا کرے بلکہ جواد وہ ہوتا ہے جو بن مانگے عطا کرے۔

حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کی سخاوت کے کئی واقعات مورخین نے بیان کئے ہیں۔

- احمد بن حدید بیان کرتا ہے کہ میں ایک جماعت کے ہمراہ حج کیلئے اپنے وطن سے روانہ ہوا

ا۔ محمد بن یعقوب کلینی، الکافی ج1، ص327، 1405ھ (بیروت: دارالاضواء)

۲۔ ابوھلال العسکری، الفرق فی اللغۃ، ص167، 1403ھ (دارالافاق الجدیدہ)

راستے میں ڈاکوؤں نے ہمیں لوٹ لیا۔ جب میں مدینہ داخل ہوا تو راستے میں میری ملاقات ابوجعفر (حضرت امام محمد تقی جوادؑ) سے ہوئی تو وہ مجھے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آئے۔ میں نے انہیں اپنے ساتھ ہونے والی ڈکیتی کی واردات کے متعلق بتایا تو آپؑ نے حکم دیا کہ مجھے دیناروں کی ایک تھیلی دی جائے۔

پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کا جتنا مال لوٹا گیا ہے اس قدر رقم اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دو۔ میں نے اپنے ساتھیوں کے پاس آ کر وہ مال اس قدر تقسیم کیا جتنا کسی کا مال ڈاکوؤں نے چھینا تھا تو میں نے دیکھا کہ امام محمد تقی جواد علیہ السلام نے ہمیں اتنا ہی مال دیا تھا جتنا ہمارا مال لوٹا گیا تھا اس میں سے کچھ بھی کم یا زیادہ نہیں تھا۔(۱)

- علی بن ابراہیم نے اپنے والد سے نقل کیا ہے کہ میں ابوجعفر ثانی (حضرت امام محمد تقی علیہ السلام) کی خدمت میں موجود تھا کہ صالح بن محمد بن سلمان ہمدانی آپ کے پاس آئے وہ آپؑ کے بعض اموال پر آپؑ کی طرف سے متولی نگران مقرر تھے۔ صالح نے امام سے عرض کیا: میری جان آپؑ پر قربان ہو! آپؑ اپنے مال میں سے دس ہزار درہم میرے لئے حلال قرار دیں کیونکہ میں نے اتنا مال خرچ کیا ہے تو آپؑ نے فرمایا: وہ مال تم پر حلال ہے۔(۲)
- صفدی نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے کہ حضرت محمد تقی علیہ السلام ہر سال مدینہ میں دس لاکھ درہم تقسیم کرتے تھے۔(۳) آپؑ فقراء و مساکین اور محتاج لوگوں کو سوال کرنے سے پہلے ہی عطا کر دیتے تھے اس لئے آپؑ کا لقب ''جواد'' ہے۔

۱۔ بحارالانوار ج50، ص44

۲۔ بحارالانوار ج50، ص105

۳۔ صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی، الوافی بالوفیات ج4، ص79-142ھ (بیروت: دارالاحیاء التراث)۔

حضرت امام تقی الجواد علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا: ضرورت مند کا کسی کے دروازے پر جانے سے زیادہ بھلائی کرنے والے کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ خود پہل کرتے ہوئے ضرورت مندوں کیساتھ نیکی کرے کیونکہ ان کے اس طرز عمل پر انہیں اجر سے نوازا جائے گا اور یہ کام ان کیلئے باعث فخر ہوگا اور اس کا ذکر باقی رہے گا پس جب بھی کوئی شخص نیکی و بھلائی کا کام کرنے کا کا ارادہ کرے تو اسے اپنی ذات سے شروع کرے۔(۱)

درج بالا فرمان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انسان کو اس بات کی زیادہ احتیاج ہے کہ وہ فقیر کو عطا کرے بجائے یہ کہ فقیر اس سے کچھ مانگے۔ یہ سوچ انسانی و اخلاقی اقدار کی بلند ترین سوچ ہے۔ بسا اوقات انسان اس اجر و ثواب کی حقیقت اور آخرت میں اس کام کی عظمت میں غور نہ کرنے کی وجہ سے اس کو نہیں جانتا کیونکہ وہ موجودہ زندگی میں مگن ہوتا ہے اور دنیا کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم کو یوں بیان فرمایا ہے:

"یَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ هُمْ عَنِ الْآخِرَةِ هُمْ غَافِلُوْنَ"

ترجمہ: "لوگ تو دنیا کی ظاہری زندگی کے بارے میں جانتے ہیں اور وہ آخرت سے غافل ہیں۔"(۲)

حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام کے فرامین

حضرت امام محمد تقی الجواد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے ان سے جو بہترین استفادہ کر سکتے ہیں وہ ان کے ارشادات اور فرامین ہیں۔ آپؑ کے حکمت بھرے کلمات اور نصیحت آموز فرامین

۱۔ بحار الانوار ج75 ص79
۲۔ سورہ روم آیت نمبر 7

انسان کی زندگی کو روشن ومنور کردیتے ہیں۔ اب ہم آپ کے چند فرامین کو بیان کرنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔

۱۔ ''لَا تَکُنْ وَلِیًّا لِلّٰہِ تَعَالیٰ فِی الْعَلَانِیَۃِ وَ عَدُوًّ الَہُ فِیُ السِّرِّ''

ترجمہ: لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کے دوست اور تنہائی میں اس کے دشمن نہ بنو۔(۱)

۲۔ '' مَنْ عَمِلَ عَلیٰ غَیْرِ عِلْمٍ کَانَ مَا یُفْسِدُ اَکْثَرُ مِمَّا یُصْلِحُ''

ترجمہ: جو شخص علم کے بغیر عمل کرتا ہے وہ اصلاح سے زیادہ فساد پھیلاتا ہے۔(۲)

اس فرمان میں علم ومعرفت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور انسان کو اس کی عملی زندگی میں علم کی مرکزیت کی یاددہانی کروائی گئی ہے۔

۳۔ '' مَنْ اَطَاعَ ھَوَاہُ اَعْطٰی عَدُوَّہُ مُنَاہُ''

ترجمہ: جس نے اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کی اس نے اپنے دشمن کی خواہش وآرزو کو پورا کیا۔(۳)

اس زندگی میں انسان کا سب سے بڑا دشمن شیطان مردود ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

'' اِنَّہُ لَکُمْ عَدُوٌّ مُبِیْن''

یعنی شیطان تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے اگر انسان اپنی خواہشات نفسانی کی پیروی کرے تو گویا اس شیطان کے ہدف، آرزو اور خواہش کو پورا کیا۔(۴)

۱۔ بحارالانوار ج75 ص365

۲۔ محمد بن حسن حر عاملی، وسائل الشیعہ ج27، حدیث 33112، پہلا ایڈیشن

۳۔ علی نمازی شاھرودی، مستدرک سفینۃ البحار، ج6، ص94 پہلا ایڈیشن 1419ھ، (قم: موسسۃ النشر الاسلامی)

۴۔ سورہ بقرہ آیت نمبر 168

یہاں تک کہ انسانوں کے آپس میں ہونے والے جھگڑوں اور دشمنیوں میں بھی انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے دشمن کے ساتھ سوچ سمجھ کر معاملہ کرے۔ اگر وہ عاطفت اور جذبات کے تحت کچھ کرے گا تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے دشمن کے اہداف و مقاصد کو پورا کر رہا ہوگا۔

۴۔ " مَنِ اسْتَفَادَ اَخًا فِی اللّٰهِ فَقَدِ اسْتَفَادَ بَیْتًا فِی الْجَنَّةِ "

ترجمہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر کسی کو بھائی بنایا تو اس نے جنت میں ایک گھر بنایا۔(۱)

اس دوست سے قیمتی کوئی چیز نہیں جس سے آپ کا تعلق دینی اقدار کے تحت قائم ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور اس کی رحمت کے حصول کی خاطر آپ کی مدد کرتا ہو۔

۵۔ " ثَلَاثٌ یَبْلُغْنَ بِالْعَبْدِ رِضْوَانَ اللّٰهِ تَعَالٰی ، كَثْرَةُ الْاِسْتِغْفَارِ وَلِیْنُ الْجَانِبِ وَكَثْرَةُ الصَّدَقَةِ "

ترجمہ: تین کاموں سے بندہ اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی حاصل کرتا ہے۔(۲)

۱)۔ کثرت سے استغفار

۲) طبیعت میں نرمی ہونا

۳) کثرت سے صدقہ دینا۔

کثرت سے استغفار کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہمیشہ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور کمزوری

۱۔ میرزا حسین نوری طبرسی، مستدرک الوسائل ج8، ص323 تیسرا ایڈیشن 1991ء (بیروت: موسسہ آل البیت لاحیاء التراث)

۲۔ بحار الانوار ج75 ص81

کے عوامل دیکھ کر ان کی معافی، تلافی کا پختہ ارادہ کرے۔ طبیعت میں نرمی سے مراد یہ ہے کہ دوسرے انسانوں سے اچھا تعلق قائم ہونا چاہیے، صدقہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان معاشرے میں کمزور اور تنگ دست افراد کا خیال رکھے اور محتاج و نادار افراد کے متعلق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرے۔

۶۔ ''مَا هَدَمَ الدِّيْنَ مِثْلُ الْبِدَعِ''

ترجمہ: بدعت کی طرح کوئی چیز دین کو منہدم و زمین بوس کرنے والی نہیں ہے۔(۱)

بدعت سے مراد دین میں کسی چیز کا اضافہ کر دینا اور جو چیز دین میں سے نہ ہو اسے دین کی حقیقت سمجھتے ہوئے دین میں داخل کرنا۔ دین صرف اللہ تعالیٰ کی وحی سے بنتا ہے انسان کو دین بنانے کا اختیار نہیں ہے۔

۷۔ ''عُنْوَانُ صَحِيْفَةِ الْمُؤْمِنِ حُسْنُ خُلُقِهِ''

ترجمہ: مومن کے نامہ اعمال کا عنوان حسن خلق پر ہے۔(۲)

اعتقادات اور عبادات کی اپنی اہمیت ہے لیکن ان کا مطلوبہ ثمر اچھا اخلاق ہے۔ اگر کسی انسان کی شخصیت میں یہ صفت موجود نہیں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا عقیدہ کمزور اور عبادت سطحی یعنی برائے نام ہے۔

۸۔ ''مِنْ سَلَامَةِ الْاِنْسَانِ قِلَّةُ حِفْظِهٖ لِعُيُوْبِ غَيْرِهٖ وَعِنَايَتُهٗ بِاِصْلَاحِ عُيُوْبِ نَفْسِهٖ''

۱۔ مستدرک سفینۃ البحار ج6، ص576

۲۔ ابو محمد حسن بن علی حرانی، تحف العقول عن آل الرسول، ص141 پانچواں ایڈیشن 1974ء (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات)

ترجمہ: انسان کی سلامتی اس میں ہے کہ وہ دوسروں کے عیوب کو تھوڑا (کم از کم) یاد کرے اور اپنی ذات میں پائے جانیوالے عیوب کی اصلاح کرنے کا بیڑہ اٹھائے۔(۱)

ایک محتاط اور بیدار انسان اسی صحیح طریقے پر گامزن ہوتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو تلاش کر کے ان کا علاج کرتا ہے اور وہ دوسروں کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی پیروی نہیں کرتا۔

۱۔ بحارالانوار ج75 ص81

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے ارشادات

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کے ارشادات

ابو محمد حضرت امام عسکری علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں اور شیعوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَی اللّٰہِ وَالْوَرْعِ فِیْ دِیْنِکُمْ وَالاِجْتِهَادِ لِلّٰہِ وَصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَةِ اِلٰی مَنِ ائْتَمَنَکُمْ مِنْ بَرٍّا وْفَاجِرٍ، وَ طُوْلِ السُّجُوْدِ وَ حُسْنِ الْجِوَارِ، فَبِهٰذَا جَاءَ مُحَمَّدٌ ، صَلُّوَا فِیْ عَشَائِرِهِمْ وَ اشْهَدُوْا جَنَائِزِهِمْ وَ عَوَّدُوْا مَرْضَاهُمْ وَ اَدُّوْا حُقُوْقَهُمْ، فَاِنَّ الرَّجُلَ مِنْکُمْ اِذَا وَرَعَ فِیْ دِیْنِهِ وَصَدَقَ فِیْ حَدِیْثِهِ وَ اَدَّی الْاَمَانَةَ وَ حُسْنَ خُلْقِهِ مَعَ الْنَّاسِ قِیْلَ: هٰذَا شِیْعِیٌّ فَیَسَّرَنِیْ ذٰلِکَ اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ کُوْنُوا زَیْنًا وَلاَ تَکُوْنُوْا شَیْناً جَرُّوْا اِلَیْنَا کُلِّ مُوَدَّةٍ وَ ادْفَعُوْا عَنَّا کُلَ قَبِیْحٍ"(۱)

ترجمہ: میں تمہیں اپنے دین میں ورع وتقویٰ الٰہی اور اللہ کی راہ میں اجتہاد وکوشش اور راست گوئی کی نصیحت کرتا ہوں اور نیکو کار و بدکار میں سے جو بھی اپنی امانت تمہارے سپرد کرتے ہیں ان کی امانتیں انہیں بحفاظت واپس کرنے کی سفارش ونصیحت کرتا ہوں، اور تمہیں لمبے سجدے بجالانے اور ہمسایوں کے ساتھ حسن سلوک کی سفارش کرتا ہوں کیونکہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ

ا۔ تحف العقول عن آل الرسولؐ، ص362

وآلہ وسلم یہی چیزیں لے کر تشریف لائے ہیں۔ تمہیں سفارش کرتا ہوں کہ مخالفین کی جماعتوں میں نماز ادا کرو اور ان کے جنازوں میں شرکت کرو اور ان کے بیماروں کی عیادت کرو اور ان کے حقوق ادا کرو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنے دین میں متقی و پرہیز گار ہو، اور گفتگو کرتے ہوئے سچ بولتا ہو اور امانت ادا کرتا ہو اور لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک اور رویہ اچھا ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ شیعہ ہے پس میں یہ بات سن کر مسرور و شادماں ہوتا ہوں۔ تم لوگ تقویٰ الٰہی اختیار کرو اور ہمارے لئے باعث زینت بنو اور ہمارے لئے باعث شرم نہ بنو اور ہر قسم کی مودت و محبت ہماری طرف کھینچ لاؤ اور ہر قسم کی برائی اور قباحتیں ہم سے دفع کرو۔''

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے اپنے معصومین آباء و اجداد کی طرح سخت مصائب و مشکلات میں زندگی بسر کی بلکہ بعض حالات کے اعتبار سے آپؑ کی زندگی آپ کے آباء و اجداد سے زیادہ مشکلات میں گزری۔

اسی وجہ سے آپ کی عمر مبارک بہت تھوڑی تھی۔ آپؑ کی ولادت باسعادت 232ھ اور شہادت 260ھ میں واقع ہوئی۔ اس لحاظ سے آپؑ کی کل عمر مبارک صرف 28 برس تھی۔ آپؑ اور آپؑ کے جد بزرگوار حضرت امام محمد تقی جواد علیہ السلام کی عمر مبارک تمام آئمہ اطہارؑ سے کمترین عمر تھی۔ حضرت امام جواد علیہ السلام نے صرف 25 برس کی عمر میں شہادت پائی۔ ان دونوں اماموں کا کمسنی میں دنیا سے رخصت ہو جانا اس نظریے کو تقویت دیتا ہے کہ انکی طبیعی وفات نہیں ہوئی بلکہ ان کو زہر دے کر شہید کیا گیا ہے اگرچہ موت و حیات کا حقیقی مالک اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہے لیکن آئمہ معصومین علیہم السلام نے جن ظالم و جابر حکمرانوں کے زمانے میں زندگی بسر کی ہے وہ آپ کے وجود کو کسی صورت برداشت نہیں کرتے تھے اور آپؑ کو راستے سے ہٹانے کیلئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کرتے رہے۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے کم زندگی پانے کے ساتھ اپنی ساری زندگی قید و بند

کی حالت میں گزاری اور عباسی خلیفہ نے آپؑ کو اپنے جاسوسوں اور سپاہیوں کے حصار میں رکھا اس طرح کی مشکلات سب سے زیادہ آپؑ نے برداشت کیں۔ بعض آئمہ اطہارؑ کی زندگی میں انہیں کچھ عرصہ میں آزادی کا موقع مل جاتا تھا کہ وہ حکومت کی قید اور نظروں سے چھٹکارا پا لیتے تھے جیسے اگر کوئی امام شروع میں حکومتی مرکز اور دارالخلافہ سے دور زندگی گزار رہا ہوتا تھا تو امام کو کچھ عرصہ اس ظالم و جابر خلیفہ کے شر سے نجات میسر آجاتی تھی۔ لیکن امام حسن عسکری علیہ السلام نے بچپن سے حکومتی حصار اور سخت جاسوسی کی صورتحال میں زندگی بسر کی ہے۔

جب متوکل عباسی کے حکم سے آپؑ کو اپنے والد گرامی حضرت امام علی نقی الہادی علیہ السلام کے ساتھ مدینہ سے سامراء (سرمن رای) لایا گیا اس وقت آپؑ کی عمر مبارک صرف دو یا چار برس تھی اور آپؑ کو جس علاقہ میں ٹھہرایا گیا وہ فوجی چھاؤنی اور فوجی علاقہ تھا اسی وجہ سے اس جگہ کو ''عسکر'' اور جو وہاں رہتا ہوا سے ''عسکری'' کہتے ہیں۔ اس وجہ سے آپؑ کا لقب بھی ''عسکری'' ہے۔

(علماء نے امام کے لقب عسکری کی دوسری وجہ بھی بیان کی ہے کہ آپؑ نے عباسی خلیفہ کو جب اس نے آپؑ کو اپنے فوجی لشکر سے مرعوب کرنا چاہا، تو زمین و آسمان کی وسعت میں لشکر دکھایا اور فرمایا یہ زمین سے آسمان تک پھیلا ہوا میرا لشکر ہے جس کو دیکھ کر وہ مرعوب ہو گیا اور آپؑ کو ''عسکری'' کہا گیا۔ مترجم)

اس وقت سامراء کوئی علمی مرکز نہیں تھا اور نہ وہاں کوئی علمی شخصیات موجود تھیں کہ جو امام کی بارگاہ میں آکر اپنے جذبات کا اظہار کرتیں بلکہ اس وقت سامراء دارالخلافہ تھا جہاں حاکم، اس کی فوج، حواری اور مقربین مقیم تھے۔

عباسی خلیفہ نے حضرت امام علی نقی علیہ السلام اور ان کے فرزند حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو یہاں ٹھہرایا اور ان پر کڑی نظر رکھی اور امام حسن عسکری علیہ السلام اپنی شہادت تک یہاں

ہی مقیم رہے۔

درج بالا حالات کا مطالعہ کر کے ہم یہ تصور کر سکتے ہیں کہ امام حسن عسکری علیہ السلام نے کن سخت حالات اور مشکلات کا سامنا کیا ہے آپؑ پر اس قدر سختی تھی کہ بعض تاریخی روایات کے مطابق امام حسن عسکری علیہ السلام کیلئے ضروری تھا کہ وہ ہفتہ میں دو دفعہ حاکم کے دربار میں حاضر ہو کر یہ ثابت کریں کہ وہ سامراء میں ہی موجود ہیں۔

ان تمام حالات و واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام حسن عسکری علیہ السلام کو لوگوں سے بہت کم ملاقات کرنے کا موقع ملتا تھا اور یہ موقع صرف اس وقت میسر آتا تھا جب آپ کسی کام کیلئے گھر سے باہر تشریف لے جاتے یا جب خلیفہ کے دربار میں جاتے تھے ورنہ امامؑ سے ملاقات کا اظہار اور ملاقات کی کوشش کرنا پُر خطر کام تھا، بلکہ عام راستوں میں چلتے ہوئے امامؑ سے ملاقات کرنا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ جیسا کہ ایک روایت میں منقول ہے کہ آپؑ نے اپنے بعض شیعوں کو خط میں یہ تحریر فرمایا:

''خبردار! تم میں سے کوئی بھی راستے میں مجھے سلام نہ کرے اور نہ اپنے ہاتھ سے میری طرف اشارہ کرے اور نہ ہی آنکھوں سے میری جانب کوئی اشارہ کرے ورنہ تم لوگ اپنی جان کو خطرے میں ڈال لو گے۔''(۱)

آپؑ سے مروی ہے کہ! ''میرے آباء واجداد میں سے کسی کو اس قدر امتحان سے دوچار نہیں کیا گیا جتنا میرا امتحان لیا گیا ہے۔''(۲)

امام حسن عسکری علیہ السلام پر حکومتی سختیوں اور جاسوسوں کی بھرمار کی وجہ سے امت کو یہ

۱۔ بحارالانوار، ج50، ص269، حدیث34

۲۔ سید محمد کاظم قزوینی، الامام الحسن العسکری من المھد الی اللحد، ص297 پہلا ایڈیشن 1992ء (بیروت: دارالکتاب الاسلامی)

موقع نہ ملا کہ وہ آپؑ سے بہت زیادہ مستفید ہوسکیں، اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ امامؑ سے روایت کرنیوالے افراد کی ایک معقول تعداد ہے جیسا کہ سید محمد کاظم قزوینی نے اپنی کتاب ''الامام الحسن العسکری من المھد الی اللحد'' میں ان فراد کی تعداد 242 تحریر کی ہے جنہوں نے آپؑ کے علم سے استفادہ کیا اور آپؑ سے روایت کو نقل کیا ہے۔ جن حالات میں آپؑ نے زندگی گزاری ہے ان حالات کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد بھی معقول ہے۔

ہمارے پاس حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کی سیرت سے بہت تھوڑا مواد پہنچا ہے اس حوالے سے سید کاظم قزوینی اپنی کتاب ''الامام الحسن العسکری من المھد الی اللحد'' کے مقدمہ میں تحریر کرتے ہیں: ''میں یہ نہیں جانتا کہ تواریخ واحادیث اور سیرت کی کتابوں میں امام حسن عسکری علیہ السلام کے متعلق قلیل تعداد میں تاریخی مواد ہونے کی وجہ سے آپؑ کی سیرت پر اس کتابچے کی تالیف کیسے مکمل ہوگی؟''

اس سے زیادہ تعجب اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بعض ایسی چیزیں آپؑ سے منسوب کر کے کتابوں میں ڈال دی گئی ہیں جن کی تحقیق ہونا ضروری ہے۔ بلکہ اس مشکل کا آئمہ اطہار علیہم السلام کی سیرت کی اکثر کتابوں کا مطالعہ کرنے کے دوران سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً امام عسکری علیہ السلام کے متعلق روایات کی جو کتابیں تالیف کی گئی ہیں ان میں سے اکثر کتابوں میں آپؑ کے کرم وفضل کو بیان کرنے کیلئے ایک روایت تحریر کی جاتی ہے کہ جس میں غور وفکر کرنے کی بناء پر انسان اصلاً اس روایت کے صحیح ہونے میں شک کا اظہار کرتا ہے اس روایت میں یہ ذکر کیا جاتا ہے کہ معتمد عباسی جس نے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو زہر دے کر شہید کیا تھا اور اس نے اس زمانے میں زندگی بسر کی ہے جب حکومت کے حصول کیلئے بنوعباس کے درمیان آپس میں سیاسی جھگڑے کثرت سے پائے جارہے تھے، بھائی اور بھائی کے درمیان، باپ اور بیٹے کے درمیان تخت حکومت کیلئے جھگڑے ہورہے تھے، جس کی وجہ سے

حکومت کمزور ہوگئی تھی اور کوئی بھی خلیفہ چند مہینے یا چند سال تخت پر بیٹھتا تھا، اس کے بارے میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ:

''معتمد عباسی امام حسن عسکری علیہ السلام کی خدمت میں آیا اور گڑگڑاتے ہوئے عرض کیا کہ آپ میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں بیس سال تک حکومت کروں کیونکہ اس نے سابقہ عباسی خلفاء کو دیکھا کہ ان کی حکمرانی کے دن محدود تھے اور وہ کیسے تخت سے اتار دیئے گئے اور کس قدر برے انداز میں قتل کئے گئے پس پھر امام حسن عسکری علیہ السلام نے اس کیلئے یہ دعا مانگی اور اللہ نے امام کی دعا کو قبول فرمایا۔''(۱)

یہ روایت دو باتوں کو ظاہر کرتی ہے:

۱۔ امام، خدا کی طرف سے مستجاب الدعوات ہوتا ہے۔

۲۔ امام اپنے دشمنوں کے ساتھ بھی اچھائی کرتا ہے اور ان کے حق میں دعا کرتا ہے۔

جو چیز اس روایت کے حوالے شک میں مبتلا کرتی ہے اور وہ کوئی نہیں سوچتا کہ امام ایک ظالم اور ناحق سرکش کے لئے دعا فرما رہے ہیں۔ اگر امام کی دعا قبول ہوتی ہے اور امام نے اس ظالم و جابر کیلئے مجبوری اور تقیہ کی حالت میں دعا فرمائی تھی تو یقیناً یہ دعا امام کے دل سے نہیں نکلی تھی اور آپؑ نے اپنے قصد و ارادے سے اس کے حق میں دعا نہیں کی تھی یوں اللہ اس دعا کو قبول نہیں کرسکتا جو امام نے دل سے نہ کی ہو اور اس کا ارادہ نہ کیا ہو۔ لہٰذا اس روایت میں تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی مئوثر شخصیت

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام پر اثر و پرکشش شخصیت کے مالک تھے جو شخص بھی آپؑ سے ملاقات کرتا یا آپؑ کا کردار دیکھتا وہ آپؑ کا معتقد ہو جاتا اس حوالے سے کئی روایات منقول

۱۔ الامام الحسن العسکری علیہ السلام من المھد الی اللحد ص 58

ہیں مگر ہم صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کریں گے۔ آپ کی شخصیت اور کردار کے حوالے سے منقول ہے کہ جب بھی عباسی خلیفہ نے آپ کو زندان میں ڈالا اور جو دروغہ بھی آپ پر مقرر کیا گیا وہ آپ کی شخصیت اور کردار سے متاثر ہو کر اپنا طرز عمل بدل دیتا اور آپ کے عقیدت مندوں میں سے ہو جاتا۔

جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ مھتدی عباسی کے دور خلافت میں بنو عباس کے افراد اس قید خانہ کے دروغہ کے پاس آئے جس قید خانے میں حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام کو قید کیا گیا تھا اس دروغہ کا نام صالح بن وصیف تھا۔ بنو عباس کے لوگوں نے اسے کہا کہ اس قیدی پر سختی کرو اور اسے ڈھیل مت دینا۔ یہ سن کر صالح نے کہا، میں اس پر سختی نہیں کر سکتا، میں نے دو ظالم سپاہیوں کو اس پر مسلط کیا تھا جو انتہائی شریر تھے لیکن اب وہ دونوں عبادت گزار، نمازی اور روزہ دار بن چکے ہیں۔ اس پر ایک عباسی نے کہا کہ ان دونوں سپاہیوں کو میرے پاس حاضر کرو تو وہ دونوں سپاہی آ گئے۔ عباسی نے ان دونوں سے کہا: تم دونوں پر وائے ہو! اس مرد (امام حسن عسکریؑ) کے حوالے سے تم دونوں کا کیا ماجرا ہے؟ تو وہ دونوں سپاہی بولے: ہم ایسے شخص کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے جو دن میں روزہ رکھتا ہے اور رات کو عبادت کرتا ہے وہ عبادت کے سوا کوئی کام اور بات نہیں کرتا۔ جب بھی ہم نے اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو ہمارے اعضاء و جوارح پر کپکپی طاری ہو گئی اور ہمارے دل پر ایسا خوف طاری ہوتا ہے کہ ہم خود پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ جب بنو عباس کے لوگوں نے یہ بات سنی تو وہ مایوس ہو کر واپس چلے گئے۔ (۱)

دوسرا واقعہ کے حوالے سے تاریخی کتب میں مذکور ہے کہ ''ابو محمد (حضرت امام حسن عسکریؑ) کو

۱۔ اعلام الھدایۃ، الامام الحسن بن علی العسکریؑ، ج13، ص113 پہلا ایڈیشن 2004ء، (بیروت: موسسۃ التاریخ العربی)

علی بن اوتامش کے پاس قید خانے میں قید کیا گیا جو کہ آل محمد علیہم السلام سے سخت عداوت رکھتا تھا اور اولاد ابوطالبؑ سے نفرت کرتا تھا۔ اسے کہا گیا کہ اس قیدی سے جو برا سلوک کرنا جو چاہو وہ کرو۔

لیکن ابھی صرف ایک دن ہی گزرا تھا کہ اس نے خود کو امام کے قدموں میں گرا دیا اور امام حسن عسکریؑ کی عظمت وجلالت اور تعظیم وتکریم کے باعث ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ جب امام اس کے قید خانے سے باہر تشریف لائے تو یہ سب لوگوں سے اچھی بصیرت رکھتا تھا اور ہر ایک سے شفقت ونرمی سے بات کرتا تھا۔(۱)

یہ واقعات اس بات کو آشکار کرتے ہیں کہ کس قدر امام حسن عسکریؑ کی پرکشش شخصیت کا لوگوں کے دلوں پر قبضہ تھا۔ ہر مسلمان کو چاہیے کہ اس کی شخصیت ایسی پر اثر اور پرکشش ہونی چاہیے کہ اس کی گفتگو اور وعظ ونصیحت سے زیادہ اس کے کردار اور عمل کا لوگوں پر اثر ہو۔

امام حسن عسکری علیہ السلام کی نصیحتیں

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام آئمہ اہلبیت علیہم السلام میں سے گیارہویں امام اور امام مہدی علیہ السلام کے والد گرامی ہیں جنہوں نے کچھ عرصہ بعد لمبی مدت کیلئے شیعوں کی نظروں سے غائب ہو جانا تھا۔ اسی لئے ہم نے امام حسن عسکری علیہ السلام کے متعلق گفتگو کے شروع میں ہی آپ کی وہ وصیت تحریر کی ہے جس میں آپ نے شیعوں کو اس طریقہ کے مطابق عمل کرنے کیلئے ایک عام منہج تعلیم فرمایا تا کہ وہ امام زمانہؑ کی غیبت کے زمانے میں اس وصیت کی روشنی میں چلیں۔

ہم اس وصیت سے تین اہم اہداف کا استخراج کر سکتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد، ج2، ص330-329

پہلا ہدف: اسلامی تعلیمات کی پابندی

تشیع صرف قلبی نسبت اور میلان کا نام نہیں ہے بلکہ یہ آئمہ معصومینؑ کے تعلیم کردہ اقدار اور سلوک پر چلنے کا نام ہے۔ جو بھی خود کو اہلبیتؑ کا شیعہ کہلاتا ہے اس کیلئے ضروری ہے کہ وہ ان اقدار اور تعلیمات پر بھی عمل پیرا ہو جو انہوں نے تعلیم دی ہیں۔ اس کیلئے صرف جذباتی لگاؤ کافی نہیں ہے کہ وہ اعلان کرے کہ میں اہلبیتؑ کا حبدار اور موالی ہوں لیکن ان کی تعلیمات پر عمل نہ کرے۔ بہت سی روایات میں اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اہلبیت علیہم السلام سے صرف محبت، قلبی و جذباتی لگاؤ کا دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے اصولوں اور تعلیمات پر چلنا ضروری ہے۔ اس لئے امام حسن عسکری علیہ السلام نے اس وصیت میں سب سے پہلے عمل، اسلامی اقدار اور سیدھے راستہ پر چلنے پر زور دیتے ہوئے فرمایا:

''اُوْصِیْکُمْ بِتَقْوَیٰ اللّٰہِ وَالْوَرْعِ فِیْ دِیْنِکُمْ وَالْاِجْتِھَادِ لِلّٰہِ وَصِدْقِ الْحَدِیْثِ وَاَدَاءِ الْاَمَانَۃِ اِلٰی مَنْ ائْتَمَنَکُمْ''

ترجمہ: ''میں تمہیں اپنے دین میں تقویٰ الٰہی پرہیز گاری اور اللہ کی راہ میں اجتہاد و کوشش اور سچ بولنے اور جو بھی اپنی امانتیں تمہیں سپرد کرتے ہیں ان کی امانتیں انہیں بحفاظت واپس کرنے کی سفارش اور نصیحت کرتا ہوں۔''

دوسرا ہدف: اسلامی معاشرے کا فعال حصہ بن کر رہنا

بنو امیہ، بنو عباس کی حکومتوں اور خاندانِ اہلبیتؑ کی ہر دشمن حکومت نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اہلبیتؑ کا محاصرہ کر کے رکھے اور انہیں اپنے شیعوں، پیروکاروں اور عام لوگوں سے دور رکھیں تا کہ یہ امت مسلمہ کے افراد سے میل جول رکھ کر ان پر اثر انداز نہ ہوں۔ اس لئے امام حسن عسکریؑ نے شیعوں کو عام خطاب میں اس بات کی طرف متوجہ فرمایا ہے کہ وہ امت مسلمہ

سے الگ تھلگ ہو کر نہ رہیں بلکہ جمہور امت اور عام مسلمانوں کے ساتھ رہیں۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دوسروں کے ساتھ رہنے سے انسان ان کے طور طریقے اپنا لیتا ہے اور ان کے اصولوں پر چلنے لگتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ حقیقی مومن جو کہ فہم و بصیرت کا مالک ہوتا ہے اس کے بارے میں اس حوالے سے بالکل بھی نہیں ڈرنا چاہیے کہ وہ دوسروں سے متاثر ہو گا بلکہ دوسرے افراد اس سے متاثر ہوتے ہیں اور یہ ان پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اس لئے آئمہ معصومین علیہم السلام اپنے شیعوں کو اس بات کی تلقین فرماتے تھے کہ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہیں اور اپنے اپنے معاشرے اور علاقے کا فعال حصہ بن کر رہیں۔ وہ بالکل بھی دوسروں سے الگ تھلگ ہو کر نہ رہیں اور صرف اپنے گروہ تک محدود نہ رہیں کہ دوسروں سے جداگانہ زندگی گزار رہے ہوں، اس کے درج ذیل اسباب ہیں۔

۱)۔ کیونکہ جو معاشرہ، جمہور اور اکثریت سے الگ تھلگ اور دور دور رہتا ہے اس پر کوئی بھی تہمت اور الزام لگانا اور اس کی شخصیت و کردار کو داغدار کرنا آسان ہوتا ہے اگر وہ معاشرے کے دیگر مسالک کے ساتھ مل جل کر رہتا ہو تو وہ خود اسے اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ اور اسکی تائید کرتے رہیں اور لوگ اس کے بارے میں دوسروں کے الزامات اور تہمتوں کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ وہ لوگ اس کے بارے میں خود بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

۲)۔ کسی بھی معاشرے سے الگ تھلگ رہنے سے وہاں کے مکینوں کی آپس میں مخالفت، عداوت اور نفرت کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ہر معاشرے کے تمام گروہ مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے سے تعلق واسطہ قائم رکھیں تو اس سے سب کے درمیان اچھا تعلق اور محبت والفت پیدا ہوتی ہے۔

۳)۔ لوگوں سے دور رہنے سے ان تک صحیح صورت میں اپنی فکر اور نظریہ نہیں پہنچایا جا سکتا ہے یوں اسکی افکار و نظریات، اعتقادات اور آراء دوسروں کے سامنے غیر واضح اور تشویش میں مبتلا کر دینے والے ہوتے ہیں جبکہ اگر وہاں معاشرے کی تمام اکائیوں کا

ایک دوسرے سے میل جول ہوگا تو اختلاف کے باوجود ان کی افکار و نظریات معاشرے کے تمام افراد کیلئے معروف اور واضح ہوں گے اور کوئی ان کے خلاف پروپیگنڈہ نہیں کر سکے گا۔

اس لئے ہم اسکی اہمیت کی بناء پر اس بات کی تاکید کرتے ہیں اور آج کے دور میں اس کی ضرورت بھی زیادہ ہے کہ جب انسانی زندگی میں بہت کچھ بدل گیا ہے اور آج انسان پہلے سے زیادہ خود پر اعتماد و اطمینان کرتا ہے اور اپنے مقام و مرتبہ سے مطمئن ہے۔ لہٰذا ہمیں خود کو الگ تھلگ نہیں رکھنا چاہیے بلکہ معاشرے میں اپنی موجودگی کا احساس دلائیں اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کریں۔ ہم نے اس کے بہت اچھے اثرات دیکھے ہیں۔ ہم نے یہ مشاہدہ کیا ہے کہ جب مذہب اہلبیت علیہم السلام کے پیروکاروں میں سے کچھ مومنین دوسرے افراد کے ساتھ باہمی میل جول اور آنا جانا رکھتے ہیں تو وہ مذہب اہلبیت علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کا روشن چہرہ دنیا کے سامنے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور وہ دوسروں کے دل و دماغ پر خوبصورت نقوش چھوڑ جاتے ہیں۔ لہٰذا معاشرے میں دوسروں کے ساتھ آنا جانا رکھنا ایک مومن معاشرے کی مصلحت میں ہے اور ہم جن تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں اس سے اس پیغام کو دوسروں تک پہنچانے کا فائدہ حاصل ہوتا ہے۔

پس دوسرے افراد جن کا مذہب و نظریہ ہم سے مختلف ہو ان کے ساتھ مل جل کر رکھنا آئمہ معصومینؑ کو مطلوب ہے۔ خاص طور پر ایک ملک اور ملک کے مختلف محکموں اور معاشرتی تعلقات کی سطح پر یہ ضروری ہے اس سے دوسروں پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ہم اپنے بعض طلباء میں یہ منفی عادت دیکھتے ہیں کہ جب وہ کالجز اور یونیورسٹیز میں اعلیٰ تعلیم کیلئے داخلہ لیتے ہیں تو وہاں دوسرے فرقوں کے لوگوں سے جدا ہو کر رہتے ہیں اور دوسروں کے ساتھ اچھے تعلقات قائم نہیں رکھتے جو کہ اچھی بات نہیں ہے۔ ہم جن عقاید و نظریات کے

مالک ہیں ان کو ظاہر کرنے سے بالکل بھی نہیں ڈرنا چاہیے کہ ہم اس وجہ سے دوسروں سے الگ تھلگ ہو جائیں کہ ہم ان کے سامنے اپنے عقاید ونظریات کو بیان کرنے سے ہچکچائیں، خاص طور پر مثبت سوچ کی ترقی کی وجہ سے ہمیں اپنی اصلی شناخت کے ساتھ خود کو ظاہر کرنا چاہیے بلکہ خود پہل کرتے ہوئے یہ کوشش کریں کہ دوسروں کو اپنا تعارف کروائیں اور دوسروں کو یہ موقع فراہم کریں کہ وہ ہمارے متعلق جان سکیں۔

ہم نے یہ ملاحظہ کیا ہے کہ وسعت قلبی اور دوسروں سے شناسائی کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ یوں آپ اپنے عقائد، اصول اور مذہب کے بارے میں اچھے اور بہتر انداز سے مطالعہ کرتے ہیں اور انہیں دلائل سے جاننے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ کا دوسروں سے سامنا ہوگا تو وہ آپ سے آپ کے عقائد اور طور طریقوں کے متعلق دریافت کریں گے۔ لہٰذا پھر آپ یہ چیلنج سمجھتے ہیں کہ ان سوالوں کے قابل اطمینان جواب دے سکیں۔ پھر آپ مزید کتب کا مطالعہ کرتے اور بحث ومباحثہ کرتے ہیں اور یہ اس عمل کا بہترین پھل اور نتیجہ ہے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسروں کیلئے وسعت قلبی اور وسعت ذہنی پیدا ہونے سے پہلے مرحلے پر بصیرت اور فہم کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ پھر یہ وسعت قلبی اور وسعت ذہنی معاشرے کے دوسرے افراد کے سامنے اپنی پہچان کروانے کا وسیلہ قرار پاتی ہے اور یوں ہم اپنی افکار ونظریات اور آراء دوسروں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوتی ہے کہ مکتب اہلبیت علیہم السلام کی پیروی کرنیوالے نوجوان کالجز، یونیورسٹیز میں جائیں یا یہ مختلف علاقوں میں ملازمت کیلئے جائیں اور وہاں صرف اپنی ذات تک محدود رہیں بلکہ ان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ وہاں اپنے مکتب کی نمائندگی کرتے ہوئے دوسروں کو مذہب اہلبیت علیہم السلام کے بارے میں آگاہی دیں۔

حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اپنی مذکورہ وصیت میں دوسروں کے ساتھ باہمی میل جول اور روابط پر ابھارتے ہوئے فرماتے ہیں:

''صَلُّوْا فِیْ عَشَائِرِهِمْ وَاشْهَدُوْا جَنَائِزِهِمْ وَ عُوْدُوْا مَرْضَاهُمْ وَ اَدُّوْا حَقُوْقَهُمْ ،اِنَّ الرَّجُلَ مِنْكُمْ اِذَا وَرَعَ فِیْ دِیْنِهٖ وَ صَدَقَ فِیْ حَدِیْثِهٖ وَاَدَّی الْاَمَانَةَ وَحَسُنَ خُلُقُهٗ مَعَ النَّاسِ، قِیْلَ هٰذَا شِیْعِیٌّ فَیَسُرُّنِیْ ذٰلِکَ''

ترجمہ:''تم لوگ مخالفین کی جماعتوں کے ساتھ نماز ادا کرو اور ان کے جنازوں میں شرکت کرو اور ان کے مریضوں کی تیمارداری کرو، اور ان کے حقوق ادا کرو کیونکہ اگر تم میں سے کوئی دین میں متقی و پرہیز گار ہو اور سچ بولتا ہو اور امانت دار ہو اور دوسروں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتا ہو تو کہا جاتا ہے کہ یہ شیعہ ہے پس میں یہ سن کر خوش ہوتا ہوں۔اس کا مطلب یہ ہے امام اپنے پیروکاروں کو اس بات کا عادی بنانا چاہتے ہیں کہ وہ اسلامی اقدار و تعلیمات کی پابندی کریں اور دوسرے انسانوں کے ساتھ اچھا برتاؤ رکھیں۔''

تیسرا ہدف: اچھی شہرت

ہمیشہ تاریخ میں یہ کوشش کی گئی کہ سیاسی اغراض و مقاصد یا جہالت و لاعلمی یا غلطی و کوتاہی کی وجہ سے شیعیان حیدر کرار کی شہرت کو داغدار کیا جائے اور ان کی غلط تصویر لوگوں کے سامنے پیش کی جائے ۔ لہٰذا ہمارے لئے ضروری ہے ہے کہ ہم اپنے مذہب کا خوبصورت چہرہ پیش کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں اور دوسروں کے سامنے ایک شیعی معاشرے کی تصویر صاف شفاف اور دل کو موہ لینے والی ہو جبکہ یہ ہم سب (شیعیان حیدر کرارؑ) کی ذمہ داری ہے۔

اس لئے حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام اپنی وصیت میں اپنے شیعوں کو فرماتے ہیں:

''اِتَّقُوْ اللّٰهَ وَ کُوْنُوا زَيْناً وَلَا تَکُوْنُوا شَيْناً''(۱)

ترجمہ: ''تم لوگ اللہ سے ڈرو اور ہمارے لئے فخر و زینت کا باعث بنو اور ہمارے لئے شرم کا باعث نہ بنو''

ہمارے معاشرے میں بعض افراد جب یہ بات سنتے ہیں کہ وہ دوسروں کے اذہان میں اپنے مذہب کے متعلق اچھے نقوش اور خوبصورت تصویر کشی کرنے کی کوشش کریں تو وہ اس کا غلط مفہوم لیتا ہے اور آگے سے جہالت یا حماقت کی بناء پر یہ جواب دیتا ہے کہ دوسرے لوگ ہمارے بارے میں کیا کہتے ہیں ہمیں اس کی بالکل پرواہ نہیں ہے، یا وہ درج ذیل قرآنی آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں:

''وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ''

(سورہ البقرہ آیت 120)

ترجمہ: ''یہودی اور نصرانی ہرگز تم سے اس وقت تک راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے دین اور ملت کی پیروی نہ کرلو''

یہ بات درست نہیں ہے کہ ہم یہ کہیں دوسروں کے سامنے اپنی اچھی تصویر اور اپنی شہرت پیش کرنا کوئی ضروری نہیں ہے۔ بلکہ ایک مسلمان کو مسلم فرد کی حیثیت سے اپنی اچھی شہرت قائم کرنی چاہیے اور مسلمان معاشرے کو ایک معاشرے کی حیثیت سے دوسروں کے سامنے اپنی روشن تصویر پیش کرنی چاہیے۔

اور درج بالا آیت

(وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ)

۱۔ تحف العقول عن آل الرسولؐ۔ص 362

سے مراد یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دین اور اس کے اصولوں پر کاربند رہے اور اپنے اصولوں اور نظریات کو پامال کر کے دوسروں سے تعلقات استوار نہیں کرنے چاہییں اور اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ یہود اور عیسائی اس قت تک تم مسلمانوں پر دباؤ ڈالنے سے باز نہیں آئیں گے جب تک تم اپنے دین سے پیچھے نہ ہٹ جاؤ۔

پس آیت کے اس معنی و مفہوم پر کوئی اعتراض اور اشکال نہیں ہے کہ ہمیں ہر صورت میں اپنے عقائد و نظریات اور اصولوں کی پاسداری کرنی چاہیے۔

اگر کوئی مسئلہ دین و مذہب کے اصول سے ٹکراتا ہو اور آپ کے سامنے جائز امر یا استحبابی شبہ ہو اور اس کو بجالانے سے دوسروں کی نظروں میں آپ کی شہرت داغدار ہوتی ہو یا وہ آپ کے بارے میں برا تاثر لیں تو اس صورت میں عاقل شخص کیلئے مراد یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کس کی اہمیت زیادہ ہے اور کس کو ترجیح دینی چاہیے پس اس صورت میں اپنی اچھی شہرت اور صحیح تصویر کو برقرار رکھنے کو ترجیح دی جانی چاہیے۔

جب بعض انتہا پسند، متشدد مسلمانوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ ایسے کام سرانجام دیں جس سے مغربی اور غیر مسلم معاشروں میں اسلام کی بری تصویر جاتی ہے تو وہ آگے سے یہ آیت سنا دیتے ہیں۔

(وَلَنْ تَرْضٰی عَنْکَ الْیَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰی حَتّٰی تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ)

یعنی یہودی اور عیسائی اس وقت تک تم سے راضی نہیں ہوں گے جب تک تم ان کے دینی کی پیروی نہ کرو۔

ان انتہا پسند مسلمانوں کا یہ موقف غلط اور غیر سنجیدہ ہے اسی طرح اگر کوئی کام مکتب اہل بیت علیہم السلام کی بدنامی کا باعث بن رہا ہو جس کی وجہ سے عام مسلمانوں یا عالمی سطح پر مذہب

اہل بیت علیہم السلام (تشیع) کوطعن وتشنیع کریں تو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

جوشخص ان امور کا خیال رکھتا ہے یعنی اپنے مذہب اور معاشرے کی مصلحت کا خیال رکھتا ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ دوسرے کے آگے ہار مان جاتا ہے یا ان کے آگے جھک جاتا ہے بلکہ وہ اپنے مذہب (مکتب اہل بیتؑ) کی اچھی تصویر دوسرے کے سامنے پیش کرنے کا انتہائی خواہش مند ہوتا ہے۔ اسی لئے ہم آئمہ اہل بیت علیہم السلام سے وارد ہونے والی کئی روایات میں اس مفہوم و معنی کو ملاحظہ کرتے ہیں جیسا کہ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام نے شیعوں کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

"کُوْنُوْا زَیْناً وَ لَا تَکُوْنُوْا شَیْئاً"

ترجمہ: ہمارے لئے باعث فخر وزینت بنواور ہمارے لئے باعث شرم اور ننگ و عار نہ بنو"

آئمہ معصومین علیہم السلام سے منقول ایک اور روایت میں ارشاد ہوتا ہے۔

"لَا تُحِدِّثُوْا النَّاسَ بِمَا لَا یَعْرِفُوْنَ"

ترجمہ: "لوگوں سے وہ بات نہ کرو جو وہ نہیں جانتے"(۱)

یعنی تم کوئی ایسا کام نہ کرو جس سے وہ ناواقف ہوں اور وہ اس پر تمہیں طعن وتشنیع کریں ۔بشرطیکہ یہ کام دین کے بنیادی اصولوں میں سے نہ ہو۔

تیسری روایت میں معصومؑ فرماتے ہیں:

"رَحِمَ اللّٰہُ عَبْدًا اسْتَجَرَّ مَوَدَّۃُ النَّاسِ اِلٰی نَفْسِہٖ وَاِلَیْنَا"

ترجمہ: "اللہ اس بندے پر رحم کرے جو لوگوں کی الفت ومحبت کو کھینچ کر اپنی ذات اور ہم تک لے کر آتا ہے۔"(۲)

۱۔ بحارالانوار ج2،ص77،حدیث61

۲۔ بحارالانوار ج2،ص77،حدیث62

دوسروں کی نظر میں اپنی اچھی شہرت اور خوبصورت تصویر کی حفاظت کرنا ایک بلند ہدف ہے جس کا ضرور خیال رکھنا چاہیے۔ بشرطیکہ اس کی خاطر اپنے بنیادی اصولوں کو پامال نہ کیا جائے۔ لیکن اس غرض کی خاطر اپنے بعض معاشرتی رسوم و رواج اور جائز امور کو چھوڑا جاسکتا ہے کیونکہ اس صورت میں افضل وارجح (زیادہ ترجیحی کام) کو اہمیت دی جاتی ہے اس قسم کی روایات ونصوص اہل بیت علیہم السلام سے منقول ہیں جن میں انہوں نے اپنے پیروکاروں کو یہ درس دیا ہے۔

اے اللہ بحق محمد وآل محمد علیہم السلام ہمیں سیرت اہل بیت علیہم السلام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

فرمان حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام

" وَ اَشْعِرْ قَلْبَکَ الرَّحْمَةَ لِلرَّعِیَّةِ وَ الْمَحَبَّةَ لَهُمْ وَ اللُّطْفَ بِهِمْ، وَلَا تَکُوْنَنَّ عَلَیْهِمْ سَبُعًا ضَارِیًا تَغْتَنِمُ اَکْلَهُمْ، فَاِنَّهُمْ صِنْفَانِ: اِمَّا اَخٌ لَّکَ فِی الدِّیْنِ وَ اِمَّا نَظِیْرٌ لَّکَ فِی الْخَلْقِ، یَفْرُطُ مِنْهُمُ الزَّلَلُ، وَ تَعْرِضُ لَهُمُ الْعِلَلُ، وَ یُؤْتٰی عَلٰی اَیْدِیْهِمْ فِی الْعَمْدِ وَ الْخَطَاِ، فَاَعْطِهِمْ مِنْ عَفْوِکَ وَ صَفْحِکَ مِثْلِ الَّذِی تُحِبُّ اَنْ یُّعْطِیَکَ اللّٰهُ مِنْ عَفْوِهٖ وَ صَفْحِهٖ، فَاِنَّکَ فَوْقَهُمْ، وَ وَالِی الْاَمْرِ عَلَیْکَ فَوْقَکَ، وَاللّٰهُ فَوْقَ مَنْ وَّلَّاکَ، وَ قَدِ اسْتَکْفَاکَ اَمْرَهُمْ، وَ ابْتَلَاکَ بِهِمْ."

"رعایا کیلئے اپنے دل کے اندر رحم و رافت اور لطف و محبت کو جگہ دو۔ ان کیلئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ کہ انہیں نگل جانا غنیمت سمجھتے ہو اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں: ایک تو تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔ ان سے لغزشیں بھی ہوں گی، خطاؤں سے بھی انہیں سابقہ پڑے گا اور انکے ہاتھوں سے جان بوجھ کر یا بھولے چوکے سے غلطیاں بھی ہوں گی۔ تم ان سے اسی طرح عفو و درگزر سے کام لینا جس طرح اللہ سے اپنے لئے عفو و درگزر کو پسند کرتے ہو۔ اس لئے کہ تم ان پر حاکم ہو، اور تمہارے اوپر تمہارا امام حاکم ہے، اور جس (امام) نے تمہیں والی بنایا ہے اسکے اوپر اللہ ہے، اور اس نے تم سے ان لوگوں کے معاملات کی انجام دہی چاہی ہے اور انکے ذریعہ تمہاری آزمائش کی ہے۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ۵۳)

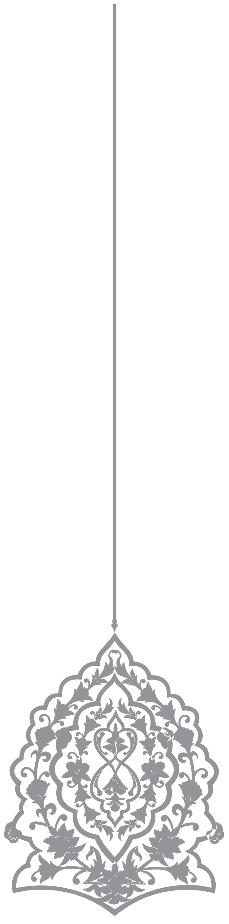

مصادر و مآخذ

مصادر و مآخذ

۱۔ ابن عبدربہ الاندلسی۔العقد الفرید (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)

۲۔ ابن منظور۔لسان العرب، ۱۹۸۸م (بیروت: دارالجیل ودارالسان العرب)

۳۔ ابوالحسن الندوی۔المرتضیٰ، الطبعۃ الاولی ۱۹۸۹م، (دمشق: دارالقلم)

۴۔ ابوالفداء الحافظ ابن کثیر۔البدایۃ والنھایۃ، الطبعۃ الاولی ۲۰۰۱م، (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)

۵۔ ابوالفرج الاصفہانی۔مقاتل الطالبیین، (بیروت: درالمعرفۃ، شرح وتحقیق: السید احمد صقر)

۶۔ ابومحمد الحسن بن علی الحرانی۔تحف العقول عن آل الرسولؐ، الطبعۃ الخامسۃ ۱۹۷۴م، (بیروت: موسسۃ الاعلمی للمطبوعات)

۷۔ ابوھلال العسکری۔الفروق فی اللغۃ، ۱۴۰۳ھ (دارالافاق الجدیدۃ)

۸۔ احمد بن ابی یعقوب الکاتب بن واضح الاخباری۔تاریخ الیعقوبی، ۱۹۶۴م، (النجف: المطبعۃ الحیدریۃ)

۹۔ احمد بن حنبل۔مسند الامام احمد بن حنبل، الطبعۃ الاولی ۱۹۹۸م، (بیروت: عالم الکتب)

۱۰۔ احمد بن علی بن حجر العسقلانی۔فتح الباری فی شرح صحیح البخاری، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۸ھ (الریاض: مکتبۃ دارالسلام)

۱۱۔ احمد بن محمد بن حجر الھیتمی ۔ الصواعق المحرقۃ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۷م، (بیروت : مئوسسۃ الرسالۃ)

۱۲۔ اعلام الھدایۃ ، الامام الحسن بن علی العسکریؑ ، الطبعۃ الاولیٰ ۲۰۰۴م، (بیروت : مئوسسۃ التاریخ العربی)

۱۳۔ آقا بزرگ الطھرانی ۔ الذریعۃ الی تصانیف الشیعۃ ، الطبعۃ الثالثۃ ۱۴۰۳م (بیروت : دارالاضواء)

۱۴۔ باقر شریف القرشی ۔ حیاۃ الامام الحسن بن علیؑ ، البطعۃ الثالثۃ ۱۳۹۳ھ (قم : دارالکتب العلمیۃ)

۱۵۔ باقر شریف القرشی ۔ حیاۃ الامام الحسین بن علیؑ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۳م (بیروت : دارالبلاغۃ)

۱۶۔ باقر شریف القرشی ۔ حیاۃ الامام علی بن موسیٰ الرضاؑ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۲م (بیروت : دار المرتضیٰ)

۱۷۔ باقر شریف القرشی ۔ حیاۃ الامام محمد الباقرؑ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۳م (بیروت : دارالبلاغۃ)

۱۸۔ باقر شریف القرشی ۔ حیاۃ الامام موسیٰ بن جعفرؑ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۳م (بیروت : دارالبلاغۃ)

۱۹۔ باقر شریف القرشی ۔ عصر الامام الصادق ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۳ھ (بیروت : دارالاضواء)

۲۰۔ تقی الدین احمد ابن تیمیۃ ۔ حقوق آل البیتؑ ، (بیروت : دارالکتب العلمیۃ ، تحقیق : عبدالقادر عطا)

۲۱۔ جریدۃ الشرق الاوسط۔صحیفۃ یومیۃ تصدر فی لندن

۲۲۔ جلال الدین عبدالرحمٰن السیوطی ۔ تاریخ الخلفاء ، الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۹۴م (بیروت: دارالجلیل)

۲۳۔ حسین علی المنتظری۔ دراسات فی ولایۃ الفقیہ ،الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۸۸م (بیروت: الدار الاسلامیۃ)

۲۴۔ السید جعفر مرتضٰی۔الحیاۃ السیاسیۃ الامام الرضاؑ،۱۹۸۶م (بیروت: دارالاضواء)

۲۵۔ السید محمد کاظم القزوینی ، الامام الحسن العسکریؑ من المھد الی اللحد ، الطبعۃ الاولیٰ۱۹۹۲م (بیروت: دارالکتاب الاسلامی)

۲۶۔ الشریف الرضی الموسوی ۔ نہج البلاغۃ ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۶۷م (بیروت : دارالکتاب اللبنانی)

۲۷۔ الشیخ المفید ۔محمد بن محمد بن النعمان ۔ الارشاد فی معرفۃ حجج اللہ علی العباد ، الطبعۃ الثانیۃ ۱۴۱۴ھ (بیروت: دارالمفید ،تحقیق مؤسسۃ آل البیتؑ لتحقیق التراث)

۲۸۔ صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی ۔ الوافی بالوفیات ،۱۴۲۰ھ (بیروت : داراحیاء التراث)

۲۹۔ ظافر القاسمی ۔نظام الحکم فی الشریعۃ والتاریخ الاسلامی ،الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۷۸م (بیروت: دارالنفائس)

۳۰۔ عباس القمی ۔سفینۃ البحار،الطبعۃ الاولی۱۴۱۴ھ (قم: دارالاسوۃ)

۳۱۔ عبدالحمید بن ابی الحدید۔شرح نہج البلاغہ،۱۹۸۷م (بیروت: دارالجیل)

۳۲۔ عبداللہ بن مسلم ابن قتیبۃ الدینوری۔الامامۃ والسیاسۃ ،الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۸۷ھ،(القاھرۃ:

مئوسسۃ الحلبی وشرکاہ، تحقیق طہ محمد الزینی)

۳۳۔ عبدالوہاب الانصاری الشعرانی۔ مختصر صفوۃ الصفوۃ ۱۹۶۷م (مکۃ: مطبعۃ النھضۃ الحدیثۃ)

۳۴۔ عزالدین ابوالحسن علی بن ابی الکرم الشیبانی۔ الکامل فی التاریخ، ۱۹۸۹م (بیروت: مئوسسۃ التاریخ العربی)

۳۵۔ علاءالدین علی المتقی الھندی۔ کنز العمال، الطبعۃ الخامسۃ ۱۴۰۵ھ (بیروت: مئوسسۃ الرسالۃ)

۳۶۔ علی النمازی الشاہرودی۔ مستدرک سفینۃ البحار، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۹ھ (قم: مئوسسۃ النشر الاسلامی)

۳۷۔ علی بن عیسیٰ الاربلی۔ کشف الغمۃ، (بیروت: دارالاضواء)

۳۸۔ محمد ابوزھرۃ۔ الامام الصادق، (بیروت: دارالندوۃ الجدیدۃ)

۳۹۔ محمد الریشھری۔ موسوعۃ الامام علی بن ابی طالبؑ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۲۱ھ (قم: دارالحدیث)

۴۰۔ محمد باقر المجلسی۔ بحارالانوار۔ الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۸۳م، (بیروت: داراحیاء التراث العربی)

۴۱۔ محمد بن اسماعیل البخاری۔ صحیح البخاری، (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)

۴۲۔ محمد بن الحسن الحر العاملی۔ وسائل الشیعۃ، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۳م (بیروت: مئوسسۃ آل البیتؑ لاحیاء التراث)

۴۳۔ محمد بن جریر الطبری۔ تاریخ الطبری، الطبعۃ الخامسۃ ۱۴۰۹ھ (بیروت: مئوسسۃ الاعلمی)

۴۴۔ محمد بن عبدالوھاب۔ مختصر سیرۃ الرسول، (الریاض: مئوسسۃ دارالکتاب السعودی)

۴۵۔ محمد بن عبداللہ الحاکم النیساپوری۔ المستدرک علی الصحیحین، الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۱۱ھ (بیروت: دارالکتب العلمیۃ)

۴۶۔ محمد بن علی بن بابویہ القمی۔ عیون اخبار الرضا، الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۴م (بیروت: مئوسسۃ

الاعلمی للمطبوعات)

۴۷۔ محمد بن یعقوب الکلینی ،الکافی ،۱۴۰۵ھ (بیروت: دارالاضواء)

۴۸۔ محمد بیومی مھران ۔الامامۃ واھل البیت،۱۹۹۵م (بیروت: دارالنھضۃ العربیۃ)

۴۹۔ محمد علی البار۔الامام علی الرضا ورسالۃ فی الطب،الطبعۃ الثالثۃ۱۹۹۲م (بیروت: دارالمنھل)

۵۰۔محمد فرید وجدی۔دائرۃ المعارف الاسلامیۃ ،الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۷۱م (بیروت: دارالمعرفۃ)

۵۱۔ محمد مھدی شمس الدین ۔ نظام الحکم والادارۃ فی الاسلام ،الطبعۃ الثانیۃ ۱۹۹۱م (بیروت: الموسسۃ الدولیۃ)

۵۲۔ محمد ناصر الدین الالبانی۔سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ،الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۸۳م (الکویت: الدار السلفیۃ ،الاردن: المکتبۃ الاسلامیۃ)

۵۳۔ مسلم بن الحجاج القشیری النیسا پوری ۔صحیح مسلم ،الطبعۃ الاولیٰ ۱۹۹۸، (الریاض: دارالمغنی)

۵۴۔ میرزا حسین النوری الطبرسی ۔مستدرک الوسائل ، الطبعۃ الثالثۃ ۱۹۹۱م (بیروت : مئوسسۃ آل البیتؑ لاحیاء التراث)